

سوراجیہ کا راستہ

پبلشرز:- نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

اوم

سوراجیہ کا راستہ

فخر پنجاب لالہ لاجپت رائے جی کے پولیٹکل لیکچروں

اور مضمونوں کا مجموعہ

مرتبہ

نرائن دت سہگل

جسے

مسرز نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

نے

کانگرس الیکٹرک پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا

حصہ اوّل　　　ایک ہزار جلد (۱۰۰۰)　　　قیمت فی جلد (عہ)

فہرست مضامین

نذر

جس طرح بچہ باپ سے مٹھائی لے کر باپ کی ہی نذر کر دیتا ہے جس طرح مالی آقا کے باغ سے پھول چن کر آقا کی ہی بھینٹ کر دیتا ہے۔ اسی طرح میں لالہ لاجپت رائے جی کے ان عالمانہ اور مُردہ ہڈیوں میں زندگی کا دم پھونکنے والے خیالات کی دلفریب مالا کو

لالہ لاجپت رائے

جی کے نام پر ممنون کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ منظور فرما کر ذرّہ نوازی کریں گے ؞

(نرائن دت سہگل)



دیباچہ

لالہ لاجپت رائے پنجاب کی وہ منور و ممتاز ہستی ہے جس پر سارا ہندوستان فخر و ناز کر رہا ہے۔ آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک و قوم کی خدمت کیلئے وقف ہو چکا ہے۔ ابتدائے زندگی میں آپ کی سرگرمیاں آریہ سماج کے کاموں میں صرف ہوتی تھیں۔ لیکن اس وقت بھی آپ ملک و قوم کی طرف سے بے پرواہ نہ تھے سنہ ۱۹۰۷ء کے پُر آشوب ایام میں آپ کو حکام نے مانڈلے میں جلا وطن کر دیا تھا۔ وہ ایام آج کل کے ایام سے بہت مختلف تھے۔ آج کل قید خانہ آزادی کا دروازہ ہے۔ اس وقت تباہی کا مسکن تھا۔ آجکل محبِ وطن اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ اُس وقت اس سے بچتے تھے۔ آج کل جو قید ہوتا ہے۔ اُس کے گھر میں خوشیاں منائی جاتی ہیں اور لوگ مبارکبادی دیتے ہیں۔ اُس وقت جو پکڑا جاتا تھا اُسکے گھر میں آہ و بکا کی صدائیں بلند ہونے لگتی تھیں۔ اور لوگ اظہار افسوس و ہمدردی کرتے تھے۔ اِس وقت قید خانہ میں جانا موجبِ فرحت باعثِ ناز ہے اُس وقت بدکلنک کا ٹیکا تصور ہوتا تھا۔ غرضیکہ اُس وقت حالات نہایت مختلف تھے۔ لیکن اس کے باوجود لالہ جی کے قدموں میں لغزش اور حوصلہ میں مایوسی کا اظہار نہ تھا۔ وہ رہا ہو کر آئے اور پھر سے اپنے کام میں اسطرح مشغول ہو گئے۔ گویا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ یہ ایام اُن کی زندگی کی آزمائش کے

ایام تھے جن سے وہ پورے طور پر کامیاب ثابت ہوئے۔ سونا کتدن ہو گیا اس کے بعد آپ امریکہ گئے۔ اور وہاں متواتر کئی سال تک مقیم رہے۔ اس عرصہ کے دوران میں بھی آپ نے اپنے مقصود کو نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ وہاں آپ نے جہاں ہندوستان کی سیاسیات کے متعلق سرگرمی کا اظہار کیا۔ اور اہالیان امریکہ کے سامنے ہندوستان کی حقیقی حالت کو کامیاب ترین طور پر پیش کیا۔ وہاں آریہ سماج کے متعلق بھی ایک نہایت پُرزور و دلکش کتاب تصنیف کی +

جب اس پنجاب پر مارشل لا کے تاریک ایام آئے۔ اس وقت آپ امریکہ میں تھے۔ ایک غریب الوطن محب قوم ملک کی جدائی میں کس طرح تڑپتا ہے۔ اُسکے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔ اُس وقت آپ کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ پر لگیں تو اُڑ کر ہندوستان پہنچ جاؤں۔ لیکن قانون نے راستہ روک رکھا تھا۔ آخر کشمکش۔ جدّوجہد۔ انتظار۔ اور تڑپ کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اور آپ نے ساحل ہند پر قدم رکھا۔ قوم نے راستہ میں آنکھیں بچھا دیں +

یہاں آکر آپ نے اپنی تمام قوت کو سیاسی باب میں صرف کرنا شروع کر دیا شروع شروع میں آپ کو مہاتما گاندھی جی سے قدرے اختلاف رائے تھا لیکن بعد میں وہ اختلاف رفع ہو گیا اور آپ بغیر تشدّد عدم تعاون کے پروگرام کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ تلک سوراجیہ فنڈ کے ایام میں آپ نے اس طرح دورہ کیا۔ کہ دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ایک ایک دن میں آپ نے تین تین چار چار مقامات پر لیکچر دیئے اور چندہ جمع کیا۔ بلاشبہ پنجاب میں جو آج بیداری نظر آ رہی ہے۔ وہ مفقود ہوتی۔ اگر لالہ جی شب و روز کی محنت گوارا نہ کرتے۔ اور گدائے قوم بن کر گاؤں گاؤں میں

آگاہ کی صدا بلند نہ کرتے +

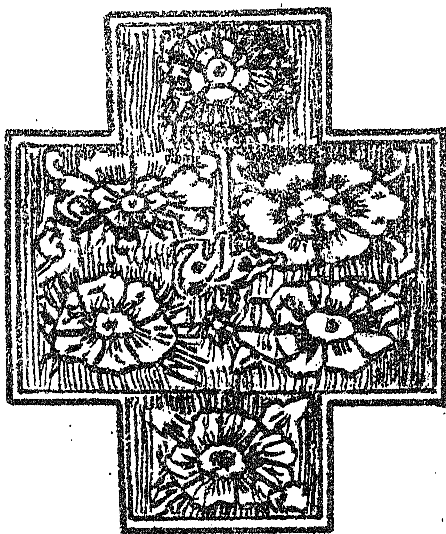
لالہ جی آج ہم میں آزاد نہیں۔ وہ جیلخانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند ہیں۔ لیکن اُن کی روح ہمارے درمیان ہے۔ اور سوراجیہ کے راستے چلتی ہوئی قوم کے سامنے مشعل ہدایت کا کام دے رہی ہے۔ لالہ جی نے اپنا جسم و جان تک بھارت کی آزادی کے لئے نچھاور کر دیا ہے اور آج اپنی آزادی بھی اس کی نذر کر دی ہے +

ایسے قومی آسمان کے درخشاں ستارے کے خیالات کو کون جاننے کا خواہاں نہ ہوگا۔ "سوراجیہ کا راستہ" لالہ جی کے اُن مضمونوں اور لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ جو آپ نے پچھلے ڈیڑھ دو سالوں میں لکھے یا دیئے ہم سمجھتے ہیں۔ کہ اس کے لئے ہم معذرت کریں تو ایک گناہ کے مرتکب ہونگے۔ لالہ جی کی روح اِن مضامین کے اندر بہ رہی ہے۔ وہ باسی نہیں ہو سکتے۔ گئے گذرے زمانہ کی داستان نہیں ہو سکتے۔ کہ ان کو ایک دفعہ پڑھ کر پھینک دیا جائے۔ بلکہ یہ اس قابل ہیں۔ کہ ان کو لائبریری کی زینت اور مطالعہ کے میز کی رونق بنایا جائے +

سوراجیہ کیا ہے؟ سوراجیہ کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اِسکے راستے میں کون کون سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ وہ کیسے دُور ہٹ سکتی ہیں۔ ترقی و تہذیب یافتہ ممالک کیا کر رہے ہیں۔ غلامی کے اثرات نے ہمارے خون کی گردش تک کو کس طرح اپنے ماتحت کر لیا ہے۔ قومی تعلیم کے کیا معنی ہیں؟ وہ کن اصولوں پر رائج ہونی چاہیئے۔ ان تمام مضامین پر لالہ جی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اِس قابل ہیں۔ کہ ان کو بار بار پڑھا جائے اور اُن پر عملدرآمد کیا جائے۔ اگر عوام میں وہ جذبہ پیدا ہو جائے

اور اُن کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری ہو جائے۔ جو لالہ جی کا منتہائے نظر ہے۔ تو یقیناً وہ وقت دُور نہیں۔ جب سویرا جیسے ہماری طرف دوڑتا ہوا آئے گا۔ اور ہندوستان میں ایک نئی زندگی کا جیتا جاگتا ظہور ہوگا دنیا دیکھے گی اور چونک اُٹھے گی۔ کہ ہندوستان خوابیدہ بیدار ہو گیا ہے۔ اور اُس کی بیداری دُنیا کے امن و امان کی اور آئندہ ترقی کی ضامن ہوگی ٭

(نرائن دت سہگل)



سوراجیہ کا راستہ

سوراجیہ

میں سوراجیہ کے لفظی معنوں پر بحث نہیں کرونگا۔ صرف اِس وقت یہہ بتاؤنگا۔ کہ سوراجیہ کی لازمی شرائط کیا ہیں۔ میری رائے میں ہم اُس وقت کہہ سکینگے کہ ہم کو سوراجیہ مل گیا جسوقت ہم کو اپنے ملک کی اندرونی و بیرونی حفاظت کا اختیار مل جائیگا۔ جب تک ہمارے مُلک کی اندرونی و بیرونی حفاظت کی ذمہ داری ایک غیر قوم کے سپاہیوں و افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ تب تک ہم برابر غلام رہیں گے۔ خواہ تمام صوبجات کی گورنریاں ہم کو مل جائیں۔ فوجی معنوں میں انگریزی گورنمنٹ نے جیسا ہم کو لاچار و بیچارہ بنا دیا ہے۔ اِس سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ انگریزی گورنمنٹ نے ہماری تاریخ میں پہلی دفعہ ہم سے مکمل ہتھیار چھینے اور ہتھیاروں کا بنانا وغیرہ جرم قرار دیدیا۔ زمانہ حال میں جنگی سائنس نے کمال درجہ کی ترقی کی ہے۔ انگریزی گورنمنٹ نے دیدہ دانستہ ہم کو اِس علم سے بے بہرہ رکھا ہے۔ ہندوستانی فوج میں ڈھائی لاکھ کے قریب ہندوستانی سپاہی ہیں

نگران کو زمانۂ حال کی جنگی سائنس سے بے بہرہ رکھا جاتا ہے۔ حال ہی میں ہوم ممبر صاحب نے اپنی تقریر میں یہ طعن دیا کہ ہم کو اس وقت فی الفور سوراجیہ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ ہم اپنے ملک کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ سر مائیکل اڈوائر نے بھی کئی دفعہ ایسا ہی طعن ہم کو دیا۔ اور بھی اکثر انگریزی حکام ہم کو یہ طعن دیتے ہیں۔ لیکن ہم دریافت کرتے ہیں کہ ہماری اس ناقابلیت کی ذمہ داری کن پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانی لڑائی کی قابلیت میں۔ بہادری میں اور طاقت میں انگریزی سپاہیوں اور انگریزی افسروں سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر ان کو وہی موقعے سیکھنے اور مشق کرنے کے دیئے جائیں جو انگریزوں کو اپنے ملک میں نیز ہندوستان میں حاصل ہیں۔ تو یہ پورے طور پر فن سپاہگری کی تمام شاخوں میں کمال پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک شخص سے ہتھیار چھین لینا اور پھر اسکو ہتھیار چلانے کے ناقابل بتانا اور بزدل کہنا یہ انگریزی تہذیب کا ہی تقاضی ہے۔ ایک ہتھیار بند مسلح آدمی کا نہتے بے ہتھیار آدمی کو طعن دینا یہ کہاں تک بجا و معقول ہے۔ اس کا انصاف ہم اپنے حکمرانوں پر چھوڑتے ہیں۔ ہم اپنی گردنیں شرم کے مارے اونچی نہیں کر سکتے۔ جبکہ ممالک غیر میں بھی انگریزی قوم کے انفلوئنس سے ہم کو ہتھیاروں کا استعمال سکھلانے سے اور فوج میں بھرتی کرنے سے محروم کیا جاتا ہے جنگ کے ایام میں بہت سے ہندوستانی امریکن فوج میں داخل ہوئے اور انہوں نے اپنے کام کو نہایت ایمانداری و بہادری سے انجام دیا۔ مگر معمولی اوقات میں ہندوستانی طالب علموں کو امریکن یونیورسٹیوں کے والنٹیئر دستوں میں لینے سے انکار کیا جاتا ہے۔ سچ ہے جن لوگوں کو اپنے ملک۔ اپنے باپ دادا کی سرزمین میں یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اپنے وطن کی حفاظت کے قابل بنا دیں۔ وہ باہر جا کر غیر اقوام سے کس طرح مساوات کے سلوک کی امید کر سکتے ہیں۔ انگریزی گورنمنٹ ہمارے سپاہیوں کو دنیا بھر کے جنگی میدانوں میں لے جاتی ہے۔ اور ان سے

ہر طرح کا کام لینی ہے۔ مگر اس پر پُورا اعتبار نہیں کرتی۔ یہ تمام سپاہی انگریزوں کے تنخواہ دار ہیں۔ اُن کے دلوں میں وُہ جذبہ نہیں جو لوگوں کو اپنے ملک و قوم کے حقوق کی حفاظت میں جانوں پر کھیلنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تب بھی ہندوستانی سپاہیوں کی وفاداری و جانبازی ضرب المثل ہوگئی ہے۔ لیکن اگر کہیں اِن کو قوم پرستی کے جذبہ سے بھر دیا جائے اور فن سپاہگری کی جملہ شاخوں سے پوری واقفیت اور ٹریننگ (مشق) دی جائے۔ تو ہمارا دعوےٰ ہے کہ یہ لوگ ایسے کارنامے دکھلائیں... کہ دنیا ان پر عش عش کرے۔ اس وقت ہندوستانی سپاہی محض انگریزوں کے تنخواہ دار نوکر ہیں۔ اُن کو بادشاہ کی وفاداری کا سبق تو دیا جاتا ہے۔ مگر قوم پرستی کے جملہ خیالات کو ارادۃً اور کوشش سے اِن سے دُور رکھا جاتا ہے۔ یہ حالت بالکل خلاف قانونِ قدرت ہے۔ اور جب تک اپنے ہی مُلک میں ہمارا یہ درجہ رہے گا اور ہماری یہ حالت رہے گی۔ تب تک ہم غلاموں کے غلام رہیں گے۔ ہمارے معزز بھائی سری نواس شاستری اور ہمارے معزز ہموطن جو وزارت کے عہدوں پر ممتاز ہیں تقریریں بھلے ہی کیا کریں۔ مگر مُلک کے ڈیفنس میں جب تک اُن کو کوئی قدرت نہیں اُن کا درجہ غلاموں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر سپرو اپنی ہر ایک تقریر میں اپنی قوم پرستی کا فخر کیا کریں۔ لیکن جب تک اُن کو اور اُن کی اولاد کو اور اُن کے ہموطنوں کو اپنے مُلک کے ڈیفنس میں ایک انگریز لفٹننٹ کے برابر بھی طاقت نہیں۔ تب تک ان کے تمام دعوے لاف زنی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

صورت حال دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو انگریزوں کو ہندوستانیوں کی وفاداری پر بھروسہ ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسی ہزار انگریزی فوج اور کئی ہزار انگریزی افسروں کا بوجھ ہندوستان کے خزانہ پر ڈال دیا جائے اور ہندوستانیوں کو فوجی لحاظ سے ذلت میں رکھا جائے اور ان کی طرف درجہ کمال

کی بے اعتباری کا اظہار کیا جائے۔ اگر ہندوستانیوں کی وفاداری پر بھروسہ نہیں ہے تو دنیا بھر میں ہندوستانیوں کی وفاداری کی لاف زنی چھوڑ دی جائے۔ ہماری رائے میں ہندوستانیوں کی وفاداری ایک لاچاری کی وفاداری ہے اور اسی سے انگریزوں کو ان پر پورا بھروسہ اور اعتماد نہیں۔ کوئی غیر قوم جو باہر سے آکر حکومت کرے محکوم قوم پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ اور اسی لئے انگریز بھی نہیں کرتے اور اس نقطۂ خیال سے ہم ان کی پالیسی کو حق بجانب خیال کرتے ہیں۔ اور اس واسطے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے درمیان اور انگریزی گورنمنٹ کے درمیان کبھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ انگریز ملٹری معاملات میں ہم کو مساوات کے حقوق عطا نہ کریں۔ ہم صرف مساوات ہی نہیں چاہتے۔ بلکہ ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہندوستانی فوج ہی ہندوستان کی حفاظت کا کام کرے اور تمام ہندوستانی نوجوانوں کو فن سپاہگری کی تمام شاخوں میں یعنی پلٹنوں۔ رسالوں۔ توپ خانوں۔ ہوائی جہازوں وغیرہ میں پوری تعلیم دی جائے۔ ہندوستانی راجوں اور مہاراجوں کو شرم نہیں آتی جبکہ وہ انگریزی فوج میں آنریری عہدے لے کر انگریزی افسروں کے اردلی کا کام کرتے ہیں۔ سر مہاراجہ پرتاب سنگھ کی بہادری کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں مگر عام طور پر ان سے کام لیا جاتا ہے۔ اردلی افسر کا۔ درگا داس کے خاندان کے ایک سپوت کے لئے بہتر ہوتا کہ معمولی کاشت سے گذارہ کرتا بجائے اس کے کہ انگریزوں کا غلام بنکر مہاراجہ کہلاتا۔

ہم تو اپنی ذات سے راجوں اور مہاراجوں کو معمولی انسانوں سے برتر رتبہ نہیں دیتے لیکن ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ جب ہم یہ سنتے ہیں کہ مہاراج جسونت سنگھ اور مہاراج درگا داس کے خاندان کا ایک رکن انگریزی افسروں کے اردلی بننے کو اپنے لئے فخر کا باعث سمجھتا ہے۔ اور اپنے اس رتبہ کے زعم میں یہ یاوہ گوئی کرتا ہے کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو بنگال اور ہندوستان کے میدانوں میں ایک

کمتر ہی بذر ہے۔ ایک آریہ کشتری کے لئے اس قسم کی یاوہ گوئی حد درجہ کی گراوٹ کا نمونہ ہے۔ اور تعجب یہ ہے کہ یہ شخص اپنے آپ کو کشتری راجپوت اور آریہ کہتا ہے۔ یہ فقرہ انگریزوں کو اس قدر بھاتا ہے کہ کرنیل ویجوڈ جیسے فراخدل انگریز نے بھی حال میں اپنے ایک آرٹیکل کے دوران میں اس کو نقل کیا ہے۔ ہماری رائے میں جس شخص نے بھی یہ کہا وہ نہایت نفرت کے قابل ہے اور کسی ہندوستانی کو کبھی یہ تسلیم نہیں کرنا چاہیئے کہ اس شخص میں کوئی گن کشتری پن کے موجود ہیں۔ اگر وہ شخص سچ مچ کشتری ہوتا تو یہ کہتا کہ اگر انگریز اس ملک سے چلے جائیں تو ہم کشتریوں کا دھرم ہوگا کہ ہم اپنی جانوں سے اپنے ہم وطنوں کے جان ومال اور ان کے ننگ وناموس کی حفاظت کریں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ انگریزوں کی جنگی پالیسی نے ہم کو بالکل بے دست وپا کر دیا ہے۔ ایشر کمیٹی کی رپورٹ نے تو ہمارے اس خیال کو اور بھی مضبوط کر دیا ہے۔ اور اس سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ معظم کا یہ اعلان کہ ہندوستان سوراجیہ کے راستہ پر ڈال دیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کی رائے میں محض ایک دل لگی ہے۔ انگریزی گورنمنٹوں کی ایمانداری پر ہم جب ہی صاد کر سکتے ہیں۔ جب وہ فوراً ایک ایسی قومی ہندوستانی فوج کی بنیاد ڈالیں جو محض تنخواہ دار نہ ہو اور جو قلیل سے قلیل عرصہ میں بلا امداد انگریزی سپاہیوں کے اپنے ملک کی حفاظت کے قابل ہو۔ ایک قلیل سے قلیل عرصہ مقرر ہو جانا چاہیئے جس میں ہر ایک گورہ سپاہی کو اس ملک سے واپس بلا لیا جائے افسروں کے لئے خواہ زیادہ عرصہ مقرر کیا جائے۔ لیکن افسر بھی حسب قابلیت تمام ہندوستانی ہونے چاہئیں۔ فوراً ملک میں جگہ جگہ اس قسم کے جنگی مدرسے کھولے جائیں جہاں ہندوستانی نوجوانوں کو فن سپاہگری کی تمام شاخوں میں تعلیم دی جائے ہر ایک کالج اور ہر ایک یونیورسٹی میں ابتدائی فوجی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اور کسی کو یونیورسٹی کی ڈگری نہ دی جائے جس نے اپنی چار سالہ تعلیم میں سے کم از کم

ایک سال جنگی مراتب کے سیکھنے میں خرچ نہ کیا ہو۔ جب تک ایسا نہ کیا جائیگا ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ گورنمنٹ کا یہ دعوےٰ کہ یہ زمانہ محض تربیت و تعلیم کا ہے۔ اور ان کی علت غائی ہندوستان کو سوراجیہ دینے کی ہے۔ اور وہ ہندوستان کو سوراجیہ کے قابل بنانا چاہتے ہیں۔ کسی اہل الرائے کی نگاہ میں باوقعت ہو سکتا ہے +

سوراجیہ عمدہ عمدہ پوشاکیں پہننے سے قیمتی گھڑیاں لگانے سے۔ قیمتی موٹر کاریں رکھنے سے۔ زرق برق اردلی رکھنے سے اور کونسلوں میں تقریریں کرنے سے یا محکمہ جات سول پر قدرے قدرت پانے سے حاصل نہ ہوگا۔ نہ وہ وکالت کے ذریعہ ہزاروں روپیہ کمانے سے یا ججی کی کرسی پر ممتاز ہونے سے ملے گا۔ نہ وہ یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریوں سے ہاتھ آئے گا۔ سوراجیہ اس وقت حاصل ہوگا جب ہر ایک ہندوستانی اپنے دل میں یہ عہد کریگا کہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی اندرونی و بیرونی حفاظت کی ذمہ داری کا وہ فرداً فرداً ذمہ وار ہے اور جب تک وہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے قابل نہیں بنتا اور اس ذمہ واری کو ادا کرنیکا ارادہ نہیں کرتا۔ وہ مرد کہلانے کا کوئی حق نہیں رکھتا چوکیداروں سے حفاظت کرانا ہماری مفروضہ امیری کی دلیل ہو سکتی ہے۔ مگر ہماری عقلمندی اور ہماری مردمی کی دلیل نہیں۔ کیونکہ جو چوکیدار ہمارے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ ہمارا نوکر نہیں۔ بلکہ ہمارا آقا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہماری اور ہمارے بچوں کی جان ہے۔ اور اس کی حفاظت میں ہمارا ننگ و ناموس ہے +

سوراجیہ کی دوسری شرط یہ ہے۔ کہ ہم کو اپنے قومی خزانہ پر پورا اختیار حاصل ہو جائے۔ ہم جس طرح چاہیں اپنے قومی محاصل وصول کریں اور خرچ کریں جبتک اس قومی خزانہ کی کنجی انگریزوں کے ہاتھ میں ہے تب تک اور کوئی بھی اصلاح ہمارے لئے کارگر نہیں ہو سکتی۔ قومی خزانہ پر اختیار پائے بغیر ہم قومی گورنمنٹ کی پہلی سیڑھی پر بھی نہیں چڑھ سکتے۔ اور اس بارہ میں جو کچھ نئی تبدیلیاں اصلاحی سکیم میں

کی گئی ہیں۔ وہ نہایت ہی کم درجہ کی ہیں +

دُنیا بھر میں کوئی ایسی گورنمنٹ نہیں ہے جو ایسی فضول خرچ ہو۔ اور جو ایک نہایت ہی غریب قوم کے محاصل کو اس طرح بے دردی سے خرچ کرتی ہو۔ جیسے کہ سرکار انگریزی ہندوستانی محاصل کو خرچ کرتی ہے۔ دنیا بھر میں کوئی ایسی گورنمنٹ نہیں ہے جو اِس قدر کثیر تنخواہیں اپنے اعلےٰ ملازموں کو دیتی ہو۔ جیسی کہ ہندوستانی گورنمنٹ ہے ممالک مغربی میں۔ جزائر برطانیہ کلاں اور صُوبجات مُتحدہ امریکہ نہایت دولتمند مُلک ہیں۔ اِن ممالک میں فی کس اوسط آمدنی ۵۰ پونڈ سالانہ کے قریب ہے اور اُن کے اعلےٰ ملازمین عملی طور پر تمام دُنیا پر حکومت کرتے ہیں۔ تاہم جزائر برطانیہ کلاں کے وزیر اعظم کی تنخواہ دس ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ نہیں اور دیگر وزرائے برطانیہ کی تنخواہ اکثر پانچہزار پونڈ سالانہ ہے۔ صوبجات متحدہ امریکہ میں کسی وزیر کو بارہ ہزار ڈالر سالانہ سے زیادہ نہیں ملتا۔ ایک ڈالر کی قیمت عام طور پر تین روپے ہوتی ہے۔ سال گذشتہ میں ۲ یا ڈھائی روپیہ کے قریب رہ گئی تھی۔ اور اسوقت ۴ روپیہ کے لگ بھگ ہے۔ جاپان میں وزیر اعظم کو اِس قدر بھی نہیں ملتا اور دیگر وزرا کی تنخواہیں اس سے بھی کم ہیں۔ مگر ہندوستان میں وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کے ممبروں کو قریباً اسی ہزار روپیہ سالانہ ملتا ہے۔ نئی ریفارم سکیم میں چھوٹے چھوٹے صوبہ جات کے وزیروں اور کونسل کے ممبروں کی تنخواہیں بھی اسی ہزار روپیہ سالانہ مقرر کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں اِن تمام افسرانِ اعلےٰ کو وائسرائے سے لیکر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تک اِس قسم کے کثیر اور مختلف الاؤنس ملتے ہیں۔ جو بعض حالتوں میں تنخواہوں سے بھی زیادہ پڑتے ہیں۔ میرے تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ بعض افسر سفر خرچ کمانے کی خاطر اکثر دورے میں رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ جس شان و شوکت سے اِن افسرانِ اعلےٰ کے واسطے خاص ریلوے ٹرین اور

خاص خاص گاڑیاں کثیر خرچ سے بنائی اور بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ اس کی نظیر دُنیا کی کسی گورنمنٹ میں نہیں ملتی۔ اور نیز تمام بار اس رعایا پر پڑتا ہے۔ جن کی اوسط آمدنی فی کس سنہ ۱۹۰۵ء میں ۳۰ روپیہ سالانہ اندازہ کی گئی تھی۔ ہماری بدقسمتی سے ہندوستانی ملازمانِ اعلےٰ کے دل میں بھی یہ خواہش نہایت زبردست طور پر قبضہ پا گئی ہے۔ کہ انکی تنخواہیں اور اُن کے الاؤنس بھی اُن کے انگریز ہم جلیسوں سے کسی طرح کم نہ ہوں۔ ہم تو اس بات کو ہی نہیں مانتے۔ کہ انگریزوں کے بغیر اس مُلک کا انتظام نہیں ہو سکتا لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے۔ کہ اس مُلک کے انتظام کے لئے انگریزوں کی ضرورت ہے۔ اور اُن کو اپنے وطن سے دُور دراز آنے کے معاوضے میں بڑی بڑی تنخواہوں کے دینے کی بھی ضرورت ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ وہی ضرورت کیوں ہندوستانی ملازمانِ اعلےٰ کی حالت میں تسلیم کر لینی چاہئے۔ ہندوستان ایک نہایت غریب مُلک ہے۔ لارڈ سنہا جیسے وفادارانِ گورنمنٹ نے اس امر کو تسلیم کیا ہے۔ کہ قریباً دس کروڑ آبادی اس مُلک کی پورے طور پر اپنا پیٹ بھر کر نہیں کھاتی۔ تاہم لارڈ سنہا اور اُن کے ہم جلیس ہندوستانی کونسلر اور وزرا اس امر پہ مصر ہیں۔ کہ انکی تنخواہیں انگریزی گورنروں اور انگریزی کونسلروں کے ہم پلہ رکھی جائیں۔ خیال یہ ہے جو ہندوستانی ان عہدوں کے لئے منتخب کئے جائینگے۔ اُن کو اگر انگریزوں کے برابر تنخواہ نہ دی جائے گی تو ان کے رتبہ اور عزت میں فرق آئے گا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ اگر یہ وزیر اور کونسلر ہندوستان کے وکیلوں اور دیگر پیشہ ور جماعتوں کے اعلےٰ طبقہ سے انتخاب کئے جائیں۔ تو ان کو اتنا مالی نقصان نہ ہو کہ وہ یہ عہدے قبول نہ کریں۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں دلیلیں بے وزن ہیں۔ چند سال ہوئے انگریزی مُدبّر تو یہ تسلیم کرتے تھے۔ کہ ہندوستانی اعلےٰ عہدہ داروں کو انگریزوں کے مقابلہ میں ۲/۳ تنخواہیں کافی ہونی چاہئیں۔ لیکن اب جب سے

کہ ہندوستان کی قوم پرست جماعت نے اصلاحی سکیم کو ناکافی سمجھ کر اُسکو نامنظور کردیا ہے۔ اکثر انگریزی مدبّروں نے اپنی رائے بدل لی ہے۔ اور وُہ بھی یہی کہنے لگے کہ ہندوستانی ممبرانِ کونسل کو اور ہندوستانی وزیروں کو وہی تنخواہیں ملنی چاہئیں جو کہ انگریزی ممبروں کو ملتی ہیں۔ امرتسر کے تاوان کے متعلق جو بحث پنجاب کی قانونی کونسل میں ہوئی۔ اس کو میں نے نہایت غور سے پڑھا۔ آنریبل مسٹر فیگن فنانشل کمشنر پنجاب اور نیز دیگر انگریزی افسروں نے نہایت فصاحت بھرے لہجوں میں ممبران کونسل کو ان فرائض کی طرف توجہ دلائی۔ جو اُن کے اوپر محصول گذار کی طرف عاید ہوتے ہیں۔ لیکن جب سوال وزیروں کی تنخواہوں کا پیدا ہوا یہ سب صاحبان خاموش رہے۔ اُس وقت محصول گذار کی تصویر اُن کے صفحۂ دل سے مِٹ گئی۔ امرتسر کے فساد کی بنیاد پر جب یوروپین اصحاب کے لئے معاوضہ تجویز کیا گیا۔ اس وقت بھی محصول گذار کی تصویر اُن کے سامنے نہ آئی۔ جب فرضی نقصانات کی بنیاد پر یوروپین لوگوں کو ہندوستانیوں کے مقابلہ میں لاکھوں روپیہ زیادہ دئے گئے۔ اس وقت بھی محصول گذار کا خیال نہ کیا گیا۔ اب جبکہ اسامیوں پر اسامیاں ہر ایک محکمہ میں ایزاد ہو رہی ہیں۔ اُس وقت بھی محصول گذار کا خیال نہیں کیا جاتا جب فضول نمائشی درباروں پر اور بے معنی توپوں کے باروت پر ہزارہا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ تب بھی محصول گذار کا خیال نہیں کیا جاتا۔ جب معزز انگریزی مہمانوں یا ہندوستانی راجوں اور مہاراجوں کے استقبال اور دعوتوں میں ہزارہا روپیہ محاصل عامہ کا خرچ کیا جاتا ہے۔ تب بھی محصول گذار کی شکل بھول جاتی ہے۔ جب انگریزی اعلےٰ حکام کے مکانوں کی آرائش میں اور اُن کے لئے بے فائدہ اور غیر ضروری اردلی اور سپاہی اور پہرہ دار بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ تب بھی محصول گذار کا خیال نہیں کیا جاتا۔ محصول گذار اس وقت یاد آتا ہے جبکہ اُس تاوان کو جو گورنمنٹ کے حکام کی نالائقی اور

غفلت سے پیدا شدہ فساد کے باعث لگانا پڑا۔ ایک شہر کی نہایت ہی غریب سے غریب آبادی سے بھی وصول کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ یہ آنسو اُس مگرمچھ کے آنسوؤں کی طرح ہیں جو جسم کے جسم اپنے پیٹ کے اندر غائب کر جاتا ہے۔ اگر ساتھ ہی آنسو بھی بہاتا جاتا ہے۔ ہمارا یہ دعوےٰ ہے کہ ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ نے جو پیمانہ تنخواہوں کا اپنے اعلےٰ افسروں کے لئے مقرر کیا ہے وہ نہایت غیر ضروری اور غیر موزون ہے۔ اگر انگریزی افسران کا اس ملک میں رہنا ضروری ہے۔ تو ان کی تعداد ہر ایک صوبہ میں قلیل سے قلیل ہونی چاہیئے اور ان کو تنخواہیں بلاشبہ ہندوستانی افسروں سے زیادہ ملنی چاہیئیں۔ لیکن جو ہندوستانی گورنمنٹ کے اعلےٰ عہدوں کو قومی خدمت کے خیال سے یا اپنے ذاتی اعزاز کی غرض سے اختیار کرتے ہیں۔ ان کو زیادہ تنخواہیں دینا بالکل غیر ضروری ہے۔ ہندوستانی وزیروں کی صورت میں شاید بعض تو ایسے ہیں جن کی آمدنی ۱۲ ہزار روپیہ سال تک نہیں پہنچتی۔ اور جو اپنے عہدوں کے الاؤنس پاکر بہت کثیر تعداد میں اپنی تنخواہوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ہم کوئی وجہ نہیں سمجھتے کہ اگر مہاتما گاندھی اپنی پچاس روپیہ ماہوار میں رہ سکتا ہے۔ تو کیوں وزیر اعظم ہو جانے کی صورت میں اسکو ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی ضرورت ہوگی۔ ہماری رائے میں ہندوستانی وزیروں کو اس قدر بڑی تنخواہیں دینا غریب رعایا پر سخت ظلم کرنا ہے۔ اگر آنریبل مسٹر پرانجپے اور آنریبل مسٹر چنتامنی اپنی وزارت سے پہلے ایثار نفسی کی سادہ زندگی بسر کرسکتے تھے۔ تو ہمیں کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ کیوں وہ اب اس بات پر اصرار کریں کہ ضروران کو پانچہزار روپیہ ماہوار تنخواہ دی جائے۔ انگریزی گورنمنٹ اس بارے میں کیوں لاچار ہے۔ اس کی وجہ صاف یہ ہے۔ کہ عدم تعاون والوں کی موجودگی میں وہ اس فریق کے تعاون سے محروم ہونا نہیں چاہتی۔ جن میں سے یہ تنخواہ دار وزیر مقرر کئے گئے ہیں۔ ہمارا اعتراض ان وزیروں کی ذات پر یا ان کی لیاقت پر یا اُن کی

ایمانداری پر نہیں ہے۔ بلکہ ہم اصول کی بحث کرتے ہیں اور ہم افسوس سے یہ نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ جو لوگ عمر بھر نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے گورنمنٹ کی فضول خرچیوں پر بڑھ چڑھ کر نکتہ چینی کرتے رہے۔ وہ خود آج اپنی تنخواہوں کے معاملہ میں کسقدر عذر اور اصرار کر رہے ہیں۔ میں نے ۱۹۱۶ء میں جو کتاب امریکہ میں تصنیف کی تھی اس میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا تھا کہ اس ملک کو ایسے قیمتی انتظام کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری غریب رعایا بوجھ سے دبی جا رہی ہے۔ اس گورنمنٹ کے عہدہ داروں کے عیش و آرام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو خرچ لاکھوں روپیہ کا پہاڑی مقامات پر کیا جا چکا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ وہ ہماری نظروں میں مجرمانہ ہے اور وہ اس اصول کو ثابت کرتا ہے کہ تکلیف اسی کو محسوس ہوتی ہے جس کے پاؤں میں کانٹا چبھے۔ بدقسمتی سے قوم کے اعلیٰ عہدیدار عام طور پر اس اصول پر کار بند نظر آتے ہیں کہ اندھا ریوڑیاں بانٹے۔ مُڑ مُڑ گھر والوں کو دے +

ان گھر والوں میں اُنھوں نے ان ہندوستانیوں کو بھی شامل کر لیا ہے جو ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اس گورنمنٹ کی فضول خرچی کبھی کم نہ ہوگی۔ جب تک کہ ہندوستان کو سوراجیہ حاصل نہ ہوگا۔ پولیٹیکل اصلاح کے ہر ایک قدم کے ساتھ ساتھ سرکاری اخراجات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور رعایا پر بوجھ زیادہ سے زیادہ پڑتا جاتا ہے۔ ہم کو اس بات کا افسوس ہے کہ جہاں ہندوستانی ممبران کونسل نے چھوٹی چھوٹی رقوم پر اعتراض کرنے میں بہت سا وقت صرف کیا۔ وہاں اُنھوں نے جب وزیروں کی تنخواہ کا سوال پیش ہوا۔ نہایت بے شرمی سے پیٹھ دکھا دی۔ اِن میں سے ہر ایک یہ اُمید رکھتا ہے۔ کہ اِن میں سے ہر ایک یا اکثر کو وزیر بننے کا موقع ملے گا +

ہماری رائے میں جو ہندوستانی قوم پرست گورنمنٹ میں شامل ہو گیا ہے

اُن مصدوں کو بھول جاتا ہے۔ جن پر وہ عمر بھر اپنی غیر سرکاری زندگی میں

دیتا رہا۔ وہ اپنی قوم پرستی پر بڑا بھاری دھبہ لگاتا ہے۔ اِن وجوہات پر اور نیز اور بہت سی دیگر وجوہات پر جن کا ذکر ہم کسی دوسرے آرٹیکل میں کریں گے سوراجیہ کی ایک لازمی شرط یہ ہے کہ قومی خزانے پر اور قوم کی جائداد پر قومی نمائندوں کا پورا اختیار حاصل ہو۔ اور قومی خزانہ سے کوئی رقم خرچ نہ ہوسکے جسکو قومی نمائندے منظور نہ کریں

اِسی مضمون کی ایک دوسری شاخ ہے جسکو فسکل اٹانومی (Fiscal Autonomy) کہا جاتا ہے۔ یعنی مالی خود مختاری۔ اس کے معنے ہیں کہ ہم کو اپنی تجارت وحرفت کی ترقی کے لئے اشیائے درآمد و برآمد یعنی Import امپورٹ اور Export ایکسپورٹ پر محصول لگانے یا نہ لگانے میں پورا اختیار ہو۔ اور اس تمام کارروائی میں ہمارے سامنے ایک ہی معیار ہو۔ یعنی اپنے مُلک کی فلاح اور بہبودی۔ اب تک یہ امر مُسلّم ہے۔ کہ اس بارے میں گورنمنٹ آف انڈیا بالکل آزاد نہیں ہے۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کو کئی بار وزیر ہند کے ایسے حکم ماننے پر مجبور کیا گیا ہے۔ جو جزائر برطانیہ کے سرمایہ داروں و تجاروں کے منافع کے لئے لگائے گئے تھے۔ ایک دفعہ لارڈ نارتھ بروک جیسے زبردست وائسرائے کو اِس واسطے مستعفی ہونا پڑا۔ کہ اُس نے سیکرٹری آف سٹیٹ کے حکم کو منظور نہ کیا۔ اب کہا جاتا ہے۔ کہ نئے اصلاح ایکٹ کے بموجب گورنمنٹ آف انڈیا اس بارے میں زیادہ آزاد ہوگئی ہے۔ اِس کی بُنیاد جائنٹ سلیکٹ کمیٹی Joint Salect Committe کی وہ رائے ہے جو اُنہوں نے اپنی رپورٹ میں ظاہر کی ہے۔ کہ جب کبھی گورنمنٹ آف انڈیا اور مجالس واضعان قانون ہند کسی مالی معاملہ پر متفق ہو جائیں تو سیکرٹری آف سٹیٹ کو کوئی دخل نہیں دینا چاہئے۔ میری رائے میں نئے ایکٹ اصلاح نے اس معاملے کے متعلق کوئی تبدیلی گورنمنٹ آف انڈیا کے اختیارات میں پیدا نہیں کی۔ ایکٹ

اصلاح ہیں جیساکہ آخری شکل میں پارلیمنٹ نے پاس کیا۔ کوئی ایسا حوالہ نہیں جس سے جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رائے کی تائید ہوتی ہو۔ علاوہ اس کے یہ صاف ظاہر ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کوئی قانون متعلقہ محصولات کونسل میں پیش نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ پہلے صاحب سیکرٹری آف سٹیٹ کی منظوری نہ حاصل کرلے۔ اور اگر گورنمنٹ آف انڈیا کوئی اس قسم کا قانون پیش بھی کردے۔ تو صاحب سیکرٹری آف سٹیٹ کو یہ اختیار ہے کہ وہ بحث کے درمیان میں بھی اس کو نامنظور کردیں۔ پچھلے دنوں کونسل آف سٹیٹ میں ایک ریزولیوشن پیش کیا گیا تھا جس میں آنریبل للو بھائی سامل داس نے فیسکل آٹونومی پر زور دیا تھا۔ مگر آنریبل مسٹر شاستری نے یہ بتلایا کہ وہ ریزولیوشن ریفارم ایکٹ کے برخلاف ہے اور آخر کار ریزولیوشن کو واپس لینا پڑا۔ بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں سیکرٹری آف سٹیٹ کے اختیارات میں کوئی معقول کمی واقعہ نہیں ہوئی۔ گورنر جنرل ہند سیکرٹری آف سٹیٹ کا ایجنٹ ہے۔ اور اس پر سیکرٹری آف سٹیٹ کے احکام کی پابندی لازمی ہے۔ وہ ان تمام قوانین کو اپنی منظوری نہ دینے سے ردی کرسکتا ہے۔ جو مجالس واضعان قانون اس کی مرضی کے خلاف بنائیں پس لوگوں کا یہ کہنا کہ ریفارم ایکٹ کے ذریعے اس بارے میں ہندوستانی کونسلوں کو کوئی ایسے مزید اختیارات ملے ہیں جس سے ان کو خاص خود مختاری حاصل ہوگئی ہو غلط ہے۔ کوئی قوم سوراجیہ رکھنے کا دعوے نہیں کر سکتی۔ جس کو باہر سے یہ حکم دیا جاتا ہو۔ کہ وہ اپنی تجارت کے متعلق بیرونی احکامات کی پیروی کرے۔ اس لئے سوراجیہ کی ایک لازمی شرط یہ ہے کہ جو ہندوستانی گورنمنٹ ہندوستانیوں کی مقرر کردہ ہو۔ اسکو اس بارے میں کامل آزادی حاصل ہو۔ سلطنت برطانیہ کی نوآبادی ایسے ہیں جہاں پر ذمہ دار حکومت حاصل ہے۔ ان کی گورنمنٹوں کو اس معاملہ میں پوری آزادی ہے جبتک اس ملک میں انگریزوں کا تقرر سیکرٹری آف سٹیٹ کی طرف سے ہوتا رہیگا۔ اور وہ

انگلینڈ پارلیمنٹ ہندوستان کی ذمہ دار نہ ہوگی۔ تب تک ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان کو سوراجیہ حاصل ہوگیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے تمام اختیارات انگریز چھوڑنا نہیں چاہتے وہ فروعی باتوں میں ہندوستانیوں کو بہت کچھ اختیارات دینے پر آمادہ ہیں لیکن جو اصل اختیارات بادشاہی کے ہیں۔ ان میں وہ کسی طرح سے کمی نہیں آنے دیتے۔ تمام ضروری اختیارات کو وہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر ان کی سلطنت اس ملک میں رہنی ہے تو ہم ان کے اس رویہ پر معترض نہیں ہوسکتے اصل بات یہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے حق کو تسلیم کرنا انگریزوں کی حکومت کی ضرورت کو ماننا اور پھر سوراجیہ کا دعوے کرنا یہ دو متضاد باتیں ہیں۔ یا تو اس ملک میں انگریزوں کی حکومت کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر ہے۔ تو ہم ان اختیارات پر اعتراض نہیں کرسکتے۔ جو حکومت کے استحکام کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ جب تک یہ نہ مانا جائے کہ اب انگریزوں کی حکومت کی مزید ضرورت اس ملک میں نہیں ہے تب تک سوراجیہ کا دعوے کرنا بے معنی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ دو طاقتیں اس ملک میں حکومت کریں۔ آخری طاقت جس کا نام بادشاہت ہے ایک ہی کے ہاتھ میں رہ سکتی ہے اگر یہ اختیارات کلی طور پر اور قطعی طور پر اسی طور سے ہندوستان کی پارلیمنٹ کو حاصل ہو جائیں۔ جیسے کہ کینیڈا میں یا جنوبی افریقہ میں یا آسٹریلیا میں وہاں کی پارلیمنٹوں کو حاصل ہیں۔ تو کہا جائے گا کہ ہم کو سوراجیہ مل گیا۔ ورنہ جب تک اس ملک کی حکومت کی باگ ڈور صاحب سیکرٹری آف سٹیٹ یا برطانوی وزارت کے ہاتھ میں ہے تب تک یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ ہم سوراجیہ کے نزدیک پہنچ گئے یہ اصلاحیں جو اس وقت ملک میں جاری ہوگئی ہیں۔ انکی وقعت ان کھلونوں سے زیادہ نہیں جو بچوں کو ان کا دل بہلانے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ بچے اکثر اوقات راجہ اور وزیر بن کر کھیلتے ہیں۔ اور اپنی مٹی یا لکڑی کی فوجیں بناتے ہیں

مگر وُہ بھی جانتے ہیں کہ یہ اصلی چیزیں نہیں ہیں۔ اِسی طرح سے ہندوستانیوں کو جو جدید اختیارات اِس اصلاح کی سکیم میں حاصل ہونے بیان کئے جاتے ہیں ان کی کوئی اصلیت نہیں نیشنل کانگریس نے اس ماہیت کو سمجھ کر اپنے امرتسر کے اجلاس میں بھی ان اصلاحات کے برخلاف نامنظوری کی آواز بلند کی تھی۔ اور اب تو چندماہ کے تجربہ سے ثابت بھی ہوگیا ہے۔ کہ یہ کونسلیں محض ایک دل لگی کا سامان ہیں +

یہ آرٹیکل ابھی مکمل نہ لکھا جا چکا تھا۔ کہ مسٹر مانٹیگو کی وُہ سپیچ جو انہوں نے لنکا شائر ڈیپوٹیشن کے جواب میں کی۔ میری نظر سے گذری۔ مسٹر مانٹیگو نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان فسکل آٹونومی (مالی خودمختاری) کا اتنا ہی حقدار ہے۔ جتنا کہ کینیڈا۔ آسٹریلیا اور خود برطانیہ کلاں۔ اور اس نے جو محصولات کہ اس وقت باہر سے آئے ہوئے روئی کے کپڑے پر انڈیا گورنمنٹ نے لگائے ہیں ان میں دخل دینا نامنظور کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس بات سے انکار نہیں کیا۔ اور انکار کر بھی کس طرح سکتا تھا۔ کہ سیکرٹری آف سٹیٹ کو حق ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فیصلہ جات متعلقہ معاملہ محصولات درآمد و برآمد کو جس وقت چاہے منسوخ کر دے۔ جب تک سیکرٹری آف سٹیٹ کا یہ حق جاتا نہ رہیگا۔ اور ہندوستانی کو یہ حق حاصل نہ ہو جائے گا۔ کہ وُہ پوری آزادی سے محصولات لگائیں یا نہ لگائیں تب تک ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ ہم کو سوراجیہ مِل گیا۔ سوراجیہ ملنے کی یہ لازمی شرط ہے۔ کہ ہم کو اس بارے میں مکمل آزادی حاصل ہو۔ اور جب تک یہ آزادی حاصل نہ ہو ہم اپنے مُلک کا انتظام خاطرخواہ نہیں رکھ سکتے +



نامِل ورتن

شریان پردھان جی! میری بہنو اور بھائیو!!

آج سوا سال کا عرصہ ہوا۔ جب کہ میں لودھیانہ میں آیا تھا۔ اور آپ نے نہایت ہی محبت اور پریم سے میرا استقبال کیا تھا۔ اس سوا سال کے عرصے میں ملک میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ نہ صرف ملک میں ہی تبدیلیاں ہوئی ہیں بلکہ پنجاب میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے۔ کہ ہم کو سیدھا راستہ مل گیا ہے۔ سوا سال پہلے ہمارا خیال تھا۔ کہ سرکار ہم کو عرضی پرچے بھیجنے اور عرض و معروض کرنے سے حقوق دیدے گی۔ جب میں پہلے لودھیانہ میں آیا تھا۔ تو اس وقت ہم کو اُمید تھی کہ خلافت کا معاملہ اور مظالم پنجاب کا تدارک اگر پنجاب گورنمنٹ سے نہیں تو ولایت کی گورنمنٹ کے ہاتھوں سے تو ضرور ہو جائے گا۔ اسی اُمید پر ریفارم سکیم کی مخالفت نہیں کی گئی۔ مگر جب ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ

کالے اور گورے کے درمیان انصاف نہیں ہو سکتا

اور ولایت کی گورنمنٹ بھی انصاف کرنے سے قاصر ہے۔ جو وعدے ہم سے کئے گئے تھے وہ ایفا نہیں ہوئے۔ اب ہم آئندہ کسی بات کا یقین نہیں کر سکتے ہنٹر کمیٹی نے ہمارے ارادوں اور اُمیدوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔ خلافت کے معاملہ میں

ہمارے ساتھ جو بد عہدی کی گئی۔ اور پنجاب کے مظالم کی طرف جو ناانصافی کام میں لائی گئی۔ اس سے ہمیں پتہ لگ گیا کہ ہم گورنمنٹ پر کہاں تک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اسکے بعد خیال پیدا ہوا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ کیا جاوے۔ میں پہلا شخص تھا جس نے اس کے حق میں آواز بلند کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان نام نہاد کونسلوں سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ تھوڑے عرصہ بعد کلکتہ کی کانگریس کمیٹی نے نان کو اپریشن کا پروگرام پاس کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری ملکی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے جس میں ملک نے یہ محسوس کیا کہ سوائے نان ورتن کے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں گورنمنٹ نے اپنے طرزِ عمل سے بتا دیا ہے۔ کہ کوئی حاکم قوم محکوم قوم کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی جب تک کہ محکوم قوم میں انصاف حاصل کرنے کی طاقت موجود نہ ہو۔ ہر ایک ہندوستانی کو اپنے دل پر نقش کر لینا چاہیئے۔ کہ اگر ہم انصاف کرانا چاہتے ہیں تو اپنے آپ میں اس قسم کی طاقت پیدا کر لیں کہ کسی ظالم کو بھی ہم پر ظلم کرنے کی جرأت نہ ہو۔ انصاف تب ہوگا۔ جب ہم گورنمنٹ کو یہ جتلا دیں گے کہ ہم میں طاقت ہے ہم انصاف کرائیں گے اور ضرور کرائیں گے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کو ہر ایک ہندوستانی کو اپنے لوحِ دل پر نقش کر لینا چاہیئے۔ نان ورتن کا سال گذشتہ میں اعلان کیا گیا تھا۔ کہ یہ نان ورتن یا نان کواپریشن کیا چیز ہے۔ میں موٹے لفظوں میں کہدینا چاہتا ہوں کہ یہ گورنمنٹ کو اس بات کا نوٹس ہے کہ ہم گورنمنٹ پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ اس تحریک کے ذریعہ ہمنے گورنمنٹ کو یہ جتلا دیا ہے کہ ہم آئندہ کو تمہاری جڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے مدد نہ کریں گے۔ مگر صاحبان میں آپ کو یہ بھی بتلا دینا چاہتا ہوں کہ گورنمنٹ کو اپنے ہوائی جہازوں مشین گنوں اور بندوقوں پر ہی بھروسہ نہیں۔ بلکہ اس کو ان تیز سنگینوں پر بھروسہ ہے جو کہ ہم نے خود ان کے ہاتھ میں دیدی ہیں۔ ہم ہی لوگ ہیں جو کہ ان کی جڑوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ ہمارے ہی

بھائی ہیں جو کہ چند ٹکڑوں کی خاطر ہمارے ہی سر پہ جوتیاں لگا رہے ہیں۔ ہمارے ہی بھائی ہیں۔ جو تھوڑے سے معاوضہ کی خاطر اپنے ہی بھائیوں کا گلا گھونٹتے ہیں یہ گورنمنٹ ایک ہفتہ تک بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر ہم اس کو مدد نہ دیں۔ بھائیو اگر تم اس کو مدد دیتے رہو گے۔ تو کبھی آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ سوچو تو سہی کہ ہم میں کیا کمی ہے۔

سوائے چین کے ہمارا ملک تمام دُنیا میں بڑا ہے۔

ہمارے ہی اناج سے دوسرے ملک زندہ ہیں۔ دُنیا کو تہذیب سکھانے والے ہم ہیں۔ ملکوں کو فتح کرنے کی طاقت بھی ہم میں موجود ہے۔ لڑائی کے متعلق بھی ہم کسی سے کم نہیں۔ گورکھوں کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ سکھوں کی بہادری کا لوہا کون نہیں مانتا۔ علم میں۔ لیاقت میں۔ شہ زوری میں ہمارا ملک کسی سے کم نہیں۔ ہاں اگر کمی ہے تو انسانیت کے جوہر کی۔ عزت کی سوکھی روٹی کھانے کی نسبت ہم بے عزتی کے حلوے مانڈے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم روٹیوں کی خاطر اپنی عزت و حرمت قربان کرنے کو تیار نہیں۔ تمام قومیں دیکھتی ہیں کہ ہندوستانی کس باغ کے جانور ہیں۔ ہمارے ملک کی پیداوار سے دوسرے ملک مالامال ہو رہے ہیں۔ مگر ہمارے ہزاروں ایسے بھائی ہیں جن کو صرف ایک وقت کھانا نصیب ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھ کر مہاتما گاندھی نے نامل ورتن کا راستہ بتایا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ جو **شخص تم کو کوڑے لگاتا ہے اُس کے ہاتھ مت چومو**

ہم کو انگریزوں کی ذات سے نفرت نہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہم پر حاکم ہو کر نہ رہیں۔ قانون ہم بنائیں۔ انتظام ہمارے ہاتھ میں ہو۔ ہم اپنی مرضی کے مطابق راج کریں اور انگریز ہمارے نوکر ہو کر رہیں نہ کہ حاکم ہو کر۔ لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں۔ کہ

کیا ایک سال میں سوراجیہ مِل جائے گا

میں کہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کی شرائط پورے طور پر پورا کر دو گے تو ضرور سوراجیہ مل جائیگا۔ اگر اس ایک سال کے عرصہ میں سوراجیہ نہ بھی ملے تو راستہ تم کو معلوم ہو گیا ہے۔ منزلِ مقصود کا پتہ لگ گیا ہے۔ جلدی یا دیر میں منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔ مگر منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے ایمان کی ضرورت ہے۔ ایمان قائم رکھو۔ فتح نصیب ہوگی +

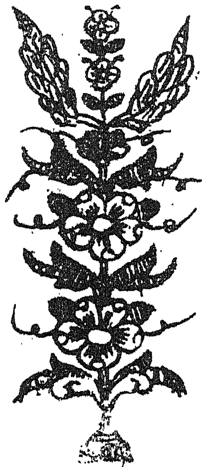
جو لوگ کہتے ہیں کہ گورنمنٹ کا وزیر بن کر ہم سوراجیہ حاصل کریں گے وہ تم کو غلط راستہ پر ڈال رہے ہیں۔ کونسلوں کا ممبر بن کر ہم سوراجیہ حاصل نہیں کر سکتے۔ گذشتہ چھ ماہ میں کیا ہوا۔ یہ سب پر ظاہر ہے۔ کس قدر مقدمات چلائے گئے۔ کیا یہ انہی وزیروں کی صلاح سے نہیں کیا گیا۔ جیل میں دیش بھگتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکوؤں۔ بدمعاشوں اور لٹیروں کی طرح برتاؤ کیا جاتا ہے۔ تنہائی کی کوٹھریوں میں بند کیا جاتا ہے۔ عدالتوں میں ہتھکڑیاں لگائی جاتی ہیں۔ کیا یہ ان نام نہاد وزیروں کی مہربانیاں نہیں ہیں۔ جس راستہ کو آزادی کا رستہ بتلایا جاتا ہے وہ غلامی کا راستہ ہے۔ جو بھائی کچھ دن پہلے ہمارے شانہ بہ شانہ ہو کر کام کرتے تھے اور جن کی دیش بھگتی کو ہم بھی کبھی تسلیم کرتے تھے وہ آج وزیری کے گدیلوں پر بیٹھ کر گورنمنٹ کا ہاتھ بٹا کر زہریلا اثر پیدا کر رہے ہیں۔ آج بہت سے بھائی جن کی لیاقت پر ملک کو ناز تھا۔ علیحدہ ہو کر ہمارے راستے میں کانٹے بچھا رہے ہیں۔ اسی واسطے تو ہم باآواز دہل کہہ رہے ہیں۔ کہ یہ کونسلیں آزادی کا راستہ نہیں بلکہ ایک خوفناک غار ہیں۔ اگر ہم مشرق کی طرف جانا چاہتے ہیں تو یہ ہم کو مغرب کی طرف کھینچنا چاہتی ہیں۔ اسی واسطے مہاتما گاندھی نے نان کوآپریشن کا راستہ بتایا ہے مگر اس کی کامیابی کے لئے شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ہندو مسلمان اور سکھ سوراجیہ حاصل کرنیکو مشترکہ کام سمجھیں۔ مسلمان بھائی ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ رہ کر کام کریں مگر ہندوؤں کو بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ مسلمانوں کو جدا کر کے تم اپنے کو ہر مقصود کو حاصل

نہیں کر سکتے۔ خالصہ بھائیو! ہندو مسلمان دونوں کو تمہارے اوپر وشواس ہے۔ تمہاری جوانمردی کا کون قائل نہیں۔ مگر خالصہ بھائیو تنخواہ لیکر لڑنا بہادری نہیں ہے۔ بلا بدلہ ہی گورو صاحبان نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے۔ کہ ہندو مسلمان اور سکھ تینوں اس سانجھے کام میں انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہوں۔ کیونکہ طاقت جمعیت میں ہے +

دوسری شرط یہ ہے۔ کہ

باپ کے کمائے ہوئے روپیہ کو دیش جاتی اور قوم کی خاطر لگا دیں

کون کہتا ہے کہ ان کی کمائی میں پاپ کا اثر نہیں ہے۔ وکیل جاگیردار۔ ولیسی مال بیچنے والے سب محسوس کرتے ہیں۔ کہ ان کی کمائی میں پاپ کا اثر موجود ہے۔ اس کا پرائشچت یہ ہی ہے کہ اس کو نیک کام میں لگایا جاوے۔ اور قومی کاموں کے دیجاوے۔ اگر ایسا ہو جائے تو سوراجیہ ملنا بالکل آسان ہے +



عدمِ تعاون پر اعتراضات

اور

اُن کے جوابات

پیاری بہنو اور بھائیو! میرا یہ فرض ہوگا۔ کہ میں آج کی تقریر میں ان حملوں کا جواب دوں۔ جو مخالفان عدم تعاون کی طرف سے کئے جا رہے ہیں سب سے پہلے میں چاہوں طرف کے مخالفوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ اوّل انگریزی حکومت جس کے دل میں عدم تعاون نے خوف پیدا کر دیا ہے۔ دوسرے وہ ہندوستانی جو اپنی مصلحت یا غلط فہمی یا کم ہمتی کے باعث اس بات پر تلے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں۔ کہ نئی ریفارم سکیم کو عمل میں لایا جائے۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنے اصلی مقصد پر آؤں۔ میں ان دونوں جماعتوں کے اعتراضوں کا مختصر جواب دونگا۔ کہا جاتا ہے کہ نان کوآپریشن کی تحریک ناکامیاب ہوئی۔ اس کے ثبوت میں وہ کہتے ہیں کہ خطابات وکالت اور سکول بہت کم تعداد میں چھوڑے گئے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ حامیان عدم تعاون نے ملک میں بے چینی پیدا کر دی ہے۔ اور صرف یہی

بھی شورش پیدا کر دی ہے۔ اِس لئے گورنمنٹ کو فوجی اخراجات میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہوئی ہے۔ جو لوگ نان کوآپریشن کی ناکامیابی کا اعلان کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کے اصول کو ہی نہیں سمجھا۔ نان کوآپریشن اِس رُوح کا نام ہے جو ہندوستان میں پھونکی جا رہی ہے +

ہمارا پروگرام ختم نہیں ہو گیا ہے۔ ہم نے صاف طور پہ کہا ہے۔ کہ قوم میں جذبۂ ایثار نفسی اور قربانی کرنے کے لئے مدآت پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ پروگرام قوم کو تیار کرنے کے لئے بجویز کیا گیا ہے۔ تاہم یہ خیال کرنا کہ اِن مدآت میں ہم کو ناکامیابی ہوئی بالکل غلط ہے +

کیا خطاب داروں نے خطاب نہیں چھوڑے

اِس میں شک نہیں کہ خطابات تھوڑے آدمیوں نے چھوڑے ہیں۔ لیکن جن آدمیوں کو خطاب ملے ہوئے ہیں اُن سے ہم کو تو اُمید ہی نہیں تھی۔ کیونکہ انہوں نے تو خطابوں کو ناجائز طریقوں اور افسروں کی خوشامدیں کرنے سے حاصل کیا ہوا ہے۔ میں نان کوآپریشن کی یہ بڑی بھاری فتح سمجھتا ہوں کہ اس نے اس قسم کے آدمیوں کے دلوں پر بھی ٹھوکر لگا دی ہے۔ جو قوم سے غداری کر کے خطاب جاگیریں حاصل کرتے ہیں اگر وہ حکومت کے دوست بننے کی بجائے مُلک کے دوست بنیں تو یہ بڑی بھاری فتح ہے جس کو ہر نان کوآپریٹر کو فخر ہونا چاہیئے۔ پروگرام میں اِس مد کو لانے سے ہماری غرض یہ تھی کہ ان خطابوں کی قدر کو کم کر دیا جائے اور ہم دعوے سے کہتے ہیں۔ کہ باوجود چیمسفورڈ اور ویلنگٹن کی تقریروں اور ہیاتات کے ہم نے اُن کی عزت کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ آپ پبلک کے سامنے پلیٹ فارم پر آنے سے گھبراتے ہیں اور اپنے اپنے بلوں میں دبکے ہوئے ہیں +

کیا وکیلوں نے عدم تعاون نہیں کیا؟

دوسری ناکامیابی وکیلوں کے معاملہ میں بتائی جاتی ہے۔ وکیلوں کے لئے اپنی اپنی پریکٹس چھوڑنے کی دو وجوہات ہیں۔ اول چونکہ وہ بدیشی انصاف پر قائم ہے اس لئے ان سے درخواست کیجائے۔ کہ اس بدیشی طریقۂ انصاف کی جگہ سودیشی انصاف قائم کریں۔ دوسرے وکیل اپنی لیاقت اور تعلیم کے لحاظ سے اس قابل سمجھے گئے تھے۔ کہ وہ قوم کی رہبری کریں گے۔ اگرچہ اس معاملہ میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی کہ اُمید تھی۔ لیکن جتنی بھی ہوئی ہے وہ قابلِ فخر ہے۔ وکیلوں کی تعداد میں سے اس وقت سب سے زیادہ لیڈر موجود ہیں۔ وکیلوں کو عادت پڑ جاتی ہے۔ کہ قانونِ وقت کا حوالہ دیں۔ کیا ہو چکا ہے۔ اور کیا ہونا چاہیئے اس میں اُن کا دماغ کام نہیں آتا۔ تیس سے زیادہ وکیلوں نے اس صوبہ میں پریکٹس ملتوی (suspend) کر دی ہے۔ انبالہ سے ایک تار مجھے موصول ہوا ہے۔ کہ وہاں چار وکیلوں نے اپنی پریکٹس کو ملتوی کرنیکا اعلان کیا ہے۔ ان میں سے ایک صاحب ایسے ہیں۔ جو انبالہ بار کے لیڈر ہیں اور ساڑھے تین ہزار روپیہ ماہوار اُن کی آمدنی ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ ہوا جب وہ مجھ سے لاہور ملے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں ایک ہزار روپیہ ماہوار تلک سوراجیہ فنڈ میں دیدوں گا۔ مجھ کو پریکٹس جاری رکھنے کی اجازت دیجائے میں نے اُن کو کہا کہ مجھ کو آپ کا دل درکار ہے۔ مجھ کو روپیہ کی ضرورت نہیں۔ جن چار اصحاب نے پریکٹس ترک کی ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ لالہ دونی چند۔ پنڈت شاہزادہ رام۔ لالہ تارا چند لالہ دیپ چند یہ تحریک بے شک ایک خدائی تحریک ہے۔ اگر تمام ہندوستان میں کوئی وکیل پریکٹس نہ چھوڑتے اور صرف شری ٗبت داس اور پنڈت موتی لال نہرو ہی چھوڑ دیتے تو بھی بڑی بھاری کامیابی کا ثبوت ہوتا۔

ملک کا کام اب اس طرح نہیں ہو سکتا کہ تمام دن بھر وکالت یا اور اپنے دوسرے

کام کرنے کے بعد شام کو شغل کے طور پر کچھ وقت پولیٹکل کام میں لگایا جائے قوم کو ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ جو دن رات بھارت بھومی کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی کوشش میں لگے ہوں۔ جہاں گذشتہ ۳۵ سال میں کانگرس نے آدھی درجن بھی ایسے آدمی پیدا نہیں کئے جو اپنا کل وقت پولیٹکل کام میں لگا دیں۔ وہاں گذشتہ چھ ماہ میں عدم تعاون کی تحریک نے سینکڑوں کی تعداد میں ایسے کام کرنے والے پیدا کر دئیے ہیں۔ کیا اسی کا نام ناکامیابی ہے ؟

کیا سکول کالجوں کی تحریک ناکامیاب رہی

تیسری ناکامیابی سکولوں اور کالجوں کی بتائی جاتی ہے۔ کامیابی کا معیار یہ نہیں کہ کتنی تعداد نے تعلیم کو چھوڑا۔ کامیابی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں سے کتنے دل اس تحریک کے برخلاف ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید کل طلباء کی تعداد میں سے پانچ فیصدی ایسے نہ ہونگے جو عدم تعاون کے برخلاف ہوں یا سکول کالجوں کو چھوڑنا نہ چاہتے ہوں۔ ان کے والدین جو لالچ میں پھنسے ہوتے ہیں۔ اور جو دھرم کے راستے سے گرے ہوئے ہیں ان کو اٹھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر اس میں قصور ہے تو والدین کا نہ کہ لڑکوں کا ؟

کہتے ہیں کہ اس تحریک نے اس ملک میں بیجا جوش و خروش پیدا کر دیا ہے مجھ کو پولیٹکل لٹریچر پڑھتے پڑھتے تیس چالیس سال ہو گئے ہیں سب جگہ لفظ استعمال کیا ہے (Unprecedented unrest) لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یعنی ان کے الفاظ میں اس قسم کی بے چینی کبھی نہ ہوئی تھی (Unprecedented Unrest) پر قوم کو مبارکباد دیتا ہوں جب تک ہم میں بے چینی نہ ہوگی ہم آزادی حاصل نہیں کر سکتے جو کہتے ہیں کہ ملک میں (Unprecedented Unrest) بے نظیر بے چینی ہے۔

طرح ہمارے کام کی داد دیتے ہیں +

کیا یہ بے چینی خطرناک ہے

سوال ۔ ہے کہ یہ بے چینی خرابی پیدا کرنے والی تو نہیں ۔ ۱۹۰۵ سے لیکر ۱۹۱۸ تک بنگال میں ایک تحریک جاری تھی ۔ ان لوگوں نے آزادی کا پرچار کیا ۔ مگر ان میں حوصلہ نہ تھا کہ وہ کھلے طور پر اسکا پرچار کرتے ۔ انہوں نے خفیہ سوسائٹیاں بنائیں بم وغیرہ کو استعمال میں لائے ۔ اس چھ مہینے کی نان کو آپریشن نے بنگال کے بم وغیرہ کو توڑ دیا ۔ کیونکہ اس تحریک نے لوگوں کے دلوں میں اس قدر بیخوفی پیدا کر دی ہے ۔ کہ سب کھلے طور پر کہتے ہیں ۔ کہ ہم کو بدیشی گورنمنٹ کی ضرورت نہیں ۔ مہاتما گاندھی نے ہم کو صداقت اور راستی کے راستہ پر چلنا سکھا دیا ہے ۔ ہم کو سوراجیہ حاصل ہو چکا ہے ۔ آپ کے سامنے ایک مذہبی پیشوا آتا ہے ۔ اور بغیر گدی کے چھننے کے خوف کے وہ آزادی کے حق میں تقریر کرتا ہے ۔ ایک کومل ہاتھوں والی بہن آتی ہے ۔ اور بیخوفی سے آزادی کا اپدیش کرتی ہے ۔ جو کہتے ہیں کہ چھ مہینے میں سوراج حاصل نہیں ہو سکتا ۔ میں اُن کو بتا دینا چاہتا ہوں ۔ کہ سوراج تو حاصل ہو چکا ہے ۔ کیونکہ جس ملک کے لوگ اور نمائندے کھلے طور پر پلیٹ فارم پر آزادی کا ڈنکا بجائیں ۔ اُن کو غیر قوم دیر تک اپنی غلامی میں نہیں رکھ سکتی ۔ یہ تحریک ہر ایک کے دل پر اثر کر رہی ہے +

آج تک یہ کبھی نہیں ہوا کہ گاؤں کے دیوانوں میں پچاس پچاس ہزار کے مجمع میں پولیٹکل تقریریں ہوں ۔ ہمارے گاؤں والے بھائی اُن تقریروں کو بیخوفی سے سننے آتے ہیں ۔ پرواده ایک چھوٹا سا قصبہ ہے ۔ وہاں ملک کے ایسے لیڈر جاتے ہیں جن کی زبان وہ نہیں جانتے لیکن فقط ان کے درشنوں کی ابھلاشا سے ایک لاکھ کی تعداد میں آدمی جمع ہو جاتے ہیں +

یہ [illegible] Unprecedented Unrest (ابھوت پورو اشانتی
کی جھلک ہے جس سے ہمارے دشمن خوفزدہ ہو کر حیران ہو رہے ہیں ہمکو یہ فخر ہے
کہ ہم نے اس نئی طاقت کو پیدا کیا ہے - اس پیدا شدہ طاقت کو کوئی سختی مار نہیں
سکتی [illegible] آپ ہی کی شکتی ہے جو کسی [illegible] پیدا نہیں ہوئی - ہم اس طاقت
کے [illegible] یہ آگ کو سوراج دے کر رہیگی ؂

کیا عدم تعاون کے پیرو بے سمجھ عوام ہیں

اس کے علاوہ ایک یہ بھی کہا جاتا ہے - کہ نان کوآپریشن کی تحریک کے پیرو
Ignorant masses (بے سمجھ عوام) ہیں ؂
پہلے گورنمنٹ کا تمام زور اس بات پر تھا - کہ صرف لکھے پڑھے آدمی چیخ پکار
کرتے ہیں - اب جب کہ عوام ان کے ساتھ ہو گیا ہے - تو گورنمنٹ اسے موبوکریسی
Mobocracy کہنے لگ گئی ہے ؂
کانگرس - چند جاگیرداروں اور دولتمندوں کا مجموعہ نہیں ہے - بلکہ ان کا مجموعہ ہے
جن کو کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا نہیں ملتا - ٹھیکیدار اور خطاب یافتہ انکو استعمال
کرتے ہیں - اور [illegible] کی مانند استعمال کر کے پھینک دیتے ہیں ہم چاہتے
ہیں کہ امیر غریبوں کیلئے ہیں نہ کہ غریب امیروں کے لئے جس وقت یہ تحریک شروع
ہوئی - گورنمنٹ نے کہا کہ فکر نہ کرو یہ خود مر جائے گی - اس کے پرچارکوں پر سختی کرنیکی
ضرورت نہیں - ہر ایک تحریک کو اس کے دشمن پہلے حقارت سے تباہ کرنیکی کوشش
کرتے ہیں - پھر لاپرواہی سے اور پھر نہ صرف مخالفت سے بلکہ پورے طور سے سختی
شروع ہو جاتی ہیں جو کہ آخری سٹیج فتح کی ہوتی ہے ؂

دو طاقتوں کا مقابلہ

ایک طرف طاقت ہے عوام الناس کی آواز کی اور دوسری طرف ہے بیوروکریسی یا [illegible]

پارٹی اور اسکے دوستوں کی۔ ان دونوں طاقتوں میں کوئی خفیہ نہیں بلکہ کھلم کھلا مقابلہ ہو رہا ہے۔ گورنمنٹ نے بھی سختی شروع کر دی ہے۔ مہاتما گاندھی کی ٹوپی بھی اُن کے دل میں اس قدر کھٹکتی ہے کہ صوبجات متوسط کی گورنمنٹ کو یہ حکم جاری کرنا پڑا کہ دفتروں میں کوئی یہ ٹوپی پہن کر نہ آئے۔

گاندھی کیپ کیوں خوف پیدا کر رہی ہے

حقیقت یہ ہے کہ دُنیا زندہ ہے۔ سینٹمنٹ (نیک جذبات) ہے جو الفاظ کسی قوم میں مقناطیسی طاقت پیدا کر دیں۔ اِن سے حاکم وقت ڈرتے ہیں۔ بنگال کی تحریک میں بندے ماترم کا لفظ حاکموں کے دل میں کھٹکتا تھا۔ اور اُنہوں نے اِس کا بولنا بند کرا دیا۔ اب وہ تنگ ہیں۔ مہاتما گاندھی کی جے سے۔ جب وہ اِس ٹوپی اور اس کھدر کے کوٹ میں زندگی کے آثار پاتے ہیں تو وہ گھبرا اُٹھتے ہیں۔ گورنمنٹ نان کو اپریشن کو ناکامیاب بنانے کے لئے اِس قسم کے پورے ہتھیار استعمال کر رہی ہے۔ کیا یہ ثابت کرتا ہے کہ نان کو اپریشن کامیاب ہو رہا ہے۔ نان کو اپریشن مُلک میں ایک زندہ طاقت ہے۔ اور گورنمنٹ اِس کو اپنی طاقت سے تباہ کرنا چاہتی ہے۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ پہلی سٹیج پر پنجاب کونسل کے انتخابات میں شہروں میں تو بالکل ہی کم اور باہر گاؤں میں بھی بہت تھوڑے ووٹ گئے۔ تیسری سٹیج پر لاہور والوں نے ایک نائی کو کھڑا کر دیا۔ اور وہ کامیاب ہوا۔ تیسری سٹیج پر میونسپل کمیٹیوں کے انتخابات آئے۔ اِسمیں بھی نان کو اپریٹروں کی ہی فتح ہوئی۔

سول ملٹری گزٹ لکھتا ہے۔ کہ لاہور والوں کے دماغ میں ایک کیڑا پیدا ہو گیا ہے۔ ہم سول ملٹری گزٹ کو بتلا دینا چاہتے ہیں۔ کہ یہ کیڑا صرف لاہور والوں کے دماغ میں ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک باغیرت ہندوستانی کے دماغ میں ہے۔ راولپنڈی کی میونسپل کمیٹی کا صوبہ کی میونسپل کانفرنس کے پریسیڈنٹ کو ایڈریس دینا اور جگہ جگہ

میونسپل کمیٹیوں کے ہال میں اُس شخص کی تصویر کا لٹکانا جسکا خیال رات کو سوتے ہوئے انگریزوں کو بھی چونکا دیتا ہے۔ ظاہر کرتا ہے کہ اب جدید دور شروع ہو گیا ہے بے رحمی کے قتل عام سے ہر روز آپ کے پیش نظر رہتے ہیں سکھوں کو کرپان پہننے کی اجازت ہے لیکن کورٹ میں پہن کر جانا منع ہے۔ سردار پرتاب سنگھ کو دونو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر پیش کیا جاتا ہے ٭

یہ پہلا موقعہ ہے کہ مذہبی ریفارمر کو ڈاکے کے مجرم قرار دیا جاتا ہے اور یاد رکھو میرے پیارے بھائیو! آزادی ایک بڑی بیش بہا نعمت ہے۔ پلنگ پر پڑے رہنے سے اگر یہ ملجائے۔ تو یہ لینے کے قابل نہیں۔ آزادی وہ ہے جو بند بند ٹوٹنے سے ملسکتی ہے۔ آزادی کے پودھا اور پرچارک یہ نہیں چاہتے کہ آزادی اُن کو آسانی سے مل جائے کیونکہ آسانی سے ملی ہوئی چیز آسانی سے ہاتھ سے نکل بھی سکتی ہے۔ ہم آزادی کے اس وقت مستحق ہونگے جب تمام جیل دوسرے قیدیوں سے خالی ہو کر پولیٹیکل قیدیوں سے بھر جائیں گے ٭

آپ مہاتما گاندھی کا لشن گا رہے ہو میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ تکلیف کے موقعہ پر اپنے جذبات کو قابو میں رکھئے۔ مہاتما گاندھی جئیں یا مریں۔ دوسرے لیڈران قوم جئیں یا مریں لیکن ہندوستان کو سوراجیہ ضرور ملجائے۔ اگر ایک لیڈر جیل میں جائے تو اس کی جگہ ہزاروں والنٹیر پیدا ہو جانے چاہئیں۔ جو راگ آزادی کا ہم نے الاپا ہے اس کی تان میں فرق نہ آنے پائے ہم جئیں یا مریں لیکن بھارت ماتا کی آزادی ہماری ہڈیوں میں لکھی ہوئی ہو ٭

میری ماتاؤ اور بہنو! آپ کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کو گھٹی میں بھی بھارت کی آزادی پلاؤ۔ جس وقت یہ مرد تم سے چھین لئے جائیں گے۔ اس وقت تم آزادی کے جھنڈے پکڑ کر جگہ جگہ جاؤ گی ٭

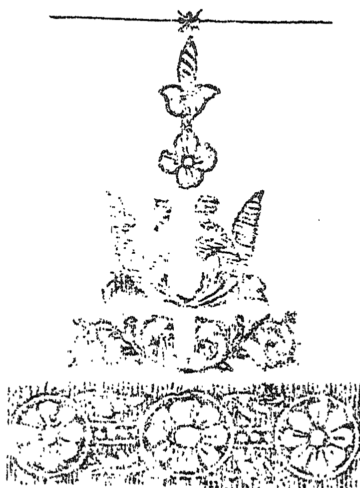
اگر ہماری ہڈیوں سے یہ آواز آئے۔ کہ بھارت توجیتا ہے۔ تو ہم جیتے ہیں جب تک یہ جذبہ اس قدر طاقتور نہ ہوگا۔ آزادی کا ملنا محال ہے۔ جس قوم سے ہماری جنگ ہے وہ بڑی طاقتور ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کا اتفاق اور قربانی پیش کرو اگر آپ ان پر ڈٹے رہوگے تو آپ کو آزادی ضرور ملجائے گی۔ اگر تھوڑی سی بات پہ آلس کروگے تو تمہاری تحریک کی پوتر تا جاتی رہے گی۔ کٹتے جاؤ۔ مگر وار نہ کرو۔ آخر دوسرا بھی کب تک وار کریگا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے مخالف بڑے لالچی اور غیر مہذب وحشی ہیں۔ نہتوں پر ہتھیار چلانا اُن کی جوانمردی ہے۔ عورتوں کے چہروں سے نقاب اٹھانا اُن کا اخلاق ہے۔ بچوں کو بید مارنا اُن کی شوالری سورماپن Chivalry (شوربیرتا) ہے۔ مگر ہم کو اپنی اصلیت کو نہیں بھولنا چاہیئے۔ ہماری اصلیت یہ ہے کہ ہم لڑیں گے اہنسا کے بل سے اور اتفاق سے۔ لیکن ہاتھ نہ اٹھائیں گے۔ یہی جادو ہے مہاتما گاندھی کی تحریک میں۔ جس کو وہ بار بار کہتے ہیں۔ یہ ہی راز ہے کامیابی کا جو میں آپ کو بتا رہا ہوں ؛

میری ماتاؤ اور بہنو۔ میں پہلے بھی آپ کو کہہ چکا ہوں۔ اور آج پھر دوبارہ شید آپ سے کہوں گا۔ تم کس بڑے گھرانے کی عورتیں ہو۔ تم ان کی اولاد ہو جو پندرہ پندرہ ہزار کی تعداد میں اپنے ننگ و ناموس کو بچانے کے لئے زندہ آگ میں کود پڑی تھیں۔ موقعہ پڑنے پر آدمی تمہاری عزت کو نہ بچا ئیں گے۔ اس لئے میں اُمید کرتا ہوں کہ جب موقعہ آئے تو تم اپنی جان پر کھیل جاؤ گی۔ یہ نرم نرم کپڑے تیاگ دو۔ ہمارا دیش شوک کی اوستھا میں ہے۔ ہم پر واجب نہیں ہے۔ کہ اس حالت میں اس قسم کے نرم نرم کپڑے اور بھوشن پہنیں۔ اس وقت اپنے لڑکے لڑکیوں کو موٹا کھانا و موٹا پہننا سکھاؤ۔ تاکہ تکلیف کے موقعہ پر وہ گھبرا نہ جائیں ؛

تمہارے دھرم کے نام پر میں تم سے اپیل کرتا ہوں کہ اپنے بچوں کو موٹا کھانا

اور موٹا پہننا سکھاؤ۔ اپنی لڑکیوں کو پیسے بچا کر سوراج فنڈ میں چندہ دینا اور آزادی کا جھنڈا سنبھالے گلی گلی پھرنا سکھا دو ؎

میں جانتا ہوں اور اس واسطے مجھ کو بھروسہ ہے کہ تمہارے اندر جو پریم اور بھگتی ہے وہ تمام دنیا کو مات کر دے گی۔ اگر ہم کو جیلخانوں نے اندر بیٹھے ہوئے یا پھانسی پر چڑھتے ہوئے یہ بھروسہ ہوگا۔ کہ تم اپنے دھرم کی شدھ رکھشا کر سکو گی۔ تو ہم بھی خوشی سے اپنی جان دیدیں گے۔ (بندے ماترم) ؎



طالبعلموں سے خطاب

پچھلی دفعہ جب گوجرانوالہ میں میں نے طلباء کے جلسے میں تقریر کی تھی تب میں نے اُن سے اپیل کی تھی۔ کہ وہ محض جذبہ میں آکر کوئی کارروائی نہ کریں۔ بلکہ اچھی طرح صلاح مشورہ کر کے قدم اُٹھائیں۔ تاکہ پھر واپس نہ ہٹانا پڑے۔ اس جلسے کے بعد لاہور کے کالجوں کے بعض منتظمان کو خوشی ہوئی تھی۔ کہ میری گوجرانوالہ کی تقریر رائیگان گئی۔ لیکن میں جانتا تھا۔ کہ آپ اس کے متعلق غور کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس سے ایک دن بعد مختلف کالجوں میں ریزولیوشن پاس کر کے اپنا فیصلہ ظاہر کر دیا۔ اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ لاہور کے نوجوانوں نے میری آواز کو سُنا ورنہ میرا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا اور میں مایوس ہو جاتا۔ آپ نے میرے دل میں کو اُمید سے بھر دیا ہے۔ اس واسطے میں سچے دل سے آپکو مبارکباد دیتا ہوں۔ اب میں ان اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کرونگا۔ جو بعض لیڈران و بہی خواہان وطن نیز کوتہ اندیش مخالفوں کیطرف سے کئے جاتے ہیں +

اعتراضات کا جواب

میں صرف بہی خواہان وطن کی دلائل کا جواب ہی دونگا۔ کہا جاتا ہے کہ طلبہ نوجوان اور نوعمر ہیں۔ انہیں پولیٹیکل کام میں نہ لگانا چاہئے ہم سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طالبعلمی

افسوس کہ طلبا کی تحریک پھر ہو گئی ہے۔ یہ لیکچر دینے کا مطلب اس واقعہ کی یاد کو تازہ ...

کے زمانہ میں علمیت کا کرۂ ہوائی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور طلباء کو سوائے
پڑھنے اور اس پر غور کرنے کے اور کچھ نہ کرنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ ان ممالک میں جہاں
لوگ دوسری قوم کے ماتحت ہوں یہ بات سخت نقصان دہ اور دھوکا دینے والی
ہے جس ملک کے لوگوں کو سچ بولنے کی اجازت نہیں۔ آئے دن قحط پڑتے ہیں۔ جہاں
ایک انفلوئنزا سے آئے سال لاکھوں آدمی مرتے ہیں۔ وہاں ملک کے کسی کونے
میں علمیت کا کرۂ ہوائی نہیں ہو سکتا۔ ایڈنبرا کیمبرج اور نیویارک میں ہو سکتا ہے لیکن
ہندوستان میں جب تک یہ روٹی کا محتاج ہے۔ تب تک ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔
مجھے کوئی شخص بتائے کہ جب گورنمنٹ نے رولٹ ایکٹ پاس کیا تھا۔ جب پنجاب
میں طلباء کو سولہ سولہ میل چلایا جاتا تھا تب یہ کرۂ ہوائی کہاں تھا۔ بچوں کو یونین
جیک کو سلام کرنے کے لئے کیوں مجبور کیا گیا۔ قصور کے لئے تو صرف لڑکوں کو محض موٹے
تازے ہونے کی وجہ سے کیوں کوڑے لگائے گئے تھے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس
ملک میں یہ کرۂ ہوائی ہو سکتا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ

طلباء کو پولیٹیکل کام میں کیوں ڈالا جاتا ہے۔

انہیں الگ رہنے دینا چاہئے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی غلط ہے۔ دنیا کی تاریخ ہمیں
بتلاتی ہے کہ جب کبھی کسی گورنمنٹ یا قوم کو خاص قسم کے ماہر پیدا کرنے کی ضرورت
ہوتی ہے۔ یا کسی اندرونی یا بیرونی حملے کے مقابلہ کے لئے فوجوں کی ضرورت
ہوتی ہے۔ تو اس وقت نوجوانوں سے ہی امداد کے لئے کہا جاتا ہے۔ اس حالت
میں اگر ہندوستان کے قومی لیڈر اٹھارہ اٹھارہ بیس بیس برس کے نوجوانوں کو
قومی سیوا کے لئے بلاتے ہیں تو کون سا گناہ کرتے ہیں +

فرانس اور جرمنی جاپان وغیرہ ممالک میں فوجی تعلیم لازمی ہے۔ کیا وہ خودکشی
کرتے ہیں جو تین سال تک اپنے نوجوانوں سے یونیورسٹی کی تعلیم چھڑاتے ہیں جن

ممالک میں جبری قومی خدمت کا رواج نہیں۔ وہاں بھی ٹیری ٹوریل آرمی اور بوائے سکاوٹ کی تحریک موجود ہے +

ان میں صرف نوجوانوں کو ہی بھرتی کیا جاتا ہے۔ گذشتہ جنگ میں انگلستان نے فوجی ملازمت کے لئے جن لوگوں کو بلایا تھا وہ ۱۸۔۲۰ برس کے نوجوان ہی تھے بھاگنا لڑنے کے لئے بوڑھوں کو کوئی بہادر نہیں پوچھتا۔ وہاں نوجوانوں کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ انگلستان میں گذشتہ جنگ میں نہ صرف نوجوان لڑکوں بلکہ لڑکیوں تک نے تعلیم چھوڑ کر دیش کی سیوا کی تھی۔ امریکہ میں بھی جنگ میں شامل ہونے سے ۶ ماہ پہلے تمام نوجوان طلبائے یونیورسٹی فوج میں بھرتی کئے گئے۔ غرضیکہ خطرے کے وقت ہر ایک قوم اپنے اُس حصّے کو طلب کرتی ہے جس میں جوش فرمانبرداری اور دلیری ہوتی ہے۔ اب آپ اپنے گھر میں ہی دیکھیں اوڈوائر نے کیا کیا تھا۔ اُس نے گذشتہ جنگ کے موقعہ پر اپنے چوہدراوں کے ذریعہ نوجوان ہی بھرتی کئے تھے۔ بلکہ ماں باپ روتے ہی رہے۔ اور اُن کے نوجوان بچّوں کو فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ میں پوچھتا ہوں اُس وقت ماں باپ کی فرمانبرداری کا حکم کہاں گیا تھا۔ ہمارے لئے موجودہ وقت ویسا ہی نازک ہے۔ ہم نے گورنمنٹ کے خلاف حصول سوراجیہ کے لئے پرامن جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ اس لئے ہمیں نوجوانوں سے یہ اپیل کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ کہ وُہ اپنی تعلیم چھوڑ کر ایک سال کے لئے نیم فوجی تعلیم حاصل کریں۔ سوراجیہ کونسلوں میں بیٹھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو ایسا سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں ڈیڑھ سو سال کی غلامی نے ایسے خیالات اُن کے دلوں میں بھر دئے۔ وُہ اور خصوصاً وکلاء اپنے عیش و عشرت کو چھوڑ نہیں سکتے +

میں اُن پر اعتراض نہیں کرتا۔ میں خود بھی ۳۰ سال تک ایسا ہی کرتا رہا ہوں سب کچھ ہمارے اردگرد کے حالات اور ہماری تعلیم کا پھل ہے۔ یاد رکھو +

قانونی دِل کبھی ترقی کن نہیں ہوتا۔

قانونی دل کبھی ترقی کن نہیں ہوتا۔ یہ ہمیشہ ترقی کا دشمن ہوتا ہے۔ وہ کیا قانون کی پیروی کرتا ہے۔ یا سابقہ فیصلوں کی۔ یہ ایک ساکن دل ہے۔ اِس وجہ سے مجھے فکر ہے۔ کہ ہمارے نئے وائسرائے ہمارے ساتھ نہ معلوم کیا سلوک کرینگے (کیونکہ وہ بھی قانون دان ہے) ٭

قانون دان ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھا کرتے ہیں۔ جس ملک میں جتنے وکیل یا قانونی طلباء زیادہ ہونگے۔ اُتنی ہی وہاں ترقی کم ہوگی۔ خدا کے واسطے اِس

قانونی دِل کو دفن کر دو۔

ہماری موجودہ تعلیم نے ہمیں بُزدل بنا دیا ہے۔ ہم جوکھوں میں نہیں پڑنا چاہتے۔ طالب علمی اور نوجوانی کے وقت تو ہمارے دل شیر ہوتے ہیں۔ لیکن دُنیا داری میں پڑکر گیدڑ بن جاتے ہیں۔ صاحبان جو لوگ تمہیں اب تک کی سیوا سے روکتے ہیں۔ وہ دیش کے دشمن ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ کونسلوں میں جا کر آہستہ آہستہ کام کرو۔ میں کہتا ہوں خوئے بدرا بہانہ بسیار والا معاملہ ہے۔ دنیا میں کوئی گورنمنٹ سخت جدوجہد کے بغیر آزادی نہیں دیتی۔ آپ جتنی دیر کرو گے۔ اُتنا ہی غلامی زیادہ استوار ہو جاویگی میں اپنے ضمیر اور اپنے ایمان سے کہتا ہوں۔ کہ میرے ملک کے نوجوانو اِس وقت ملک کو تمہاری ضرورت ہے ٭

کیا تم سوراجیہ چاہتے ہو

کیا تم سوراجیہ چاہتے ہو۔ (آوازیں آئیں۔ ہاں! ہاں) تو پھر فوراً کالجوں سے نکل آؤ۔ اور نیم فوجی تعلیم حاصل کرو۔ ہم تمہارے بدخواہ نہیں۔ ہم تم سے پہلے جیل میں جائیں گے جو تم سے آگے آنے کے لئے کہتے ہیں۔ اُنہوں نے تمہیں کبھی دغا نہیں

دیا۔ اور اب بھی نہیں دینگے۔ بہتر ہے کہ ہم اس جدوجہد میں مرجائیں یا جیل میں بیڑیاں پہنے ہوئے جان دیدیں۔ بہ نسبت اس کے کہ ہمیشہ غلامی میں رہیں۔ ترقی کی لائن سیدھی نہیں ہوتی۔ یہ بہت ٹیڑھی ہوتی ہے مجھے پورا وشواش ہے۔ کہ میری قوم جس کو پرماتمانے پندرہ بیس ہزار برس سے زندہ رکھا ہے (اگر مجھے ایسا وشواش نہ ہوتا۔ تو میں امریکہ سے کبھی واپس نہ آتا) وہ ضرور ایک دن آزاد ہوگی ٭

میں تم کو کبھی ایسی جوکھوں میں نہ ڈالوں گا۔ کہ جس میں میں اپنے آپ کو ڈالنے کے لئے تیار نہ ہوؤں۔ پورٹ آرتھر کی جنگ میں ہزاروں جاپانی اپنے ملک پر سے قربان ہوکر خود غرق ہوگئے تھے۔ عدم تعاون بھی ایک جنگ ہے۔ اگر اس میں ناکامیابی ہوئی۔ تو بھی کچھ پرواہ نہیں ٭

میں جبتک زندہ ہوں لڑتا رہوں گا

میں جب تک زندہ ہوں ملک کے لئے لڑتا رہوں گا۔ ہاں گورنمنٹ مجھے جیل میں ڈال سکتی ہے۔ لیکن جب تک میں آزاد ہوں۔ تب تک میری آزادی پر لعنت ہوگی اگر میں قوم کی آزادی کے حق میں آواز نہ اٹھاتا رہوں۔

ہندو پیغمبر دیانند کو بدنام نہ کرو۔

اب میں دیانند کالج کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ یہ کالج بند ہو جائے۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ حقیقی دیانند کالج بن جائے کہ جس کے بانی ہندو پیغمبر دیانند نے سب سے پہلے سوراجیہ کا خیال دیا تھا۔ میں جب تک جیتا ہوں۔ تب تک نہ میں تمہیں چین لینے دونگا اور نہ آپ چین لونگا۔ ڈی۔ اے وی کالج کی کنجی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم چھ ماہ تک اپنی بات پر قائم رہو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ منتظمان ڈی۔ اے۔ وی کالج اسے قومی بنانے پر مجبور ہونگے میں حیران ہوں۔ کہ منتظمان دیانند کالج ۳۲ برس سے جس چیز کے لئے ترستے

تھے۔ وہ آج ان کے سامنے پھلواڑی کی شکل میں نمودار ہے لیکن وہ اسے قبول نہیں کرتے۔ یہ موجودہ تعلیم کا بُرا اثر ہے۔ میں ڈی۔اے۔وی کالج کو اس شخص کے نام پر سچے طور پر قائم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جس نے اپنی تحریروں میں اپنے دل کو نکال کر رکھ دیا تھا۔ جس کے سینے میں حُبّ الوطنی کی آگ جل رہی تھی۔ جب وہ لکھتا تھا۔ تو اس کے دل کے ٹکڑے آنسو بن کر کاغذ پر آ جاتے تھے۔

طلبائے اسلامیہ کالج سے اپیل

اب میں اسلامیہ کالج کے طلباء سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اے محمدؐ کے ماننے والو! سچ سمجھو۔ کہ جس قوم کی وجہ سے گراوٹ ہوئی ہے۔ وہی تمہیں ترقی دے گی۔

تم اینگلو محمڈن کی بجائے اصلی مسلمان بنو۔ تمہاری دیکھا دیکھی ہم بھی اینگلو ویدک بن گئے ہیں۔

مشن کالج

مجھے مشن کالج کے طلباء پر بڑا رحم آتا ہے۔ مجھے اس کالج کے طلباء نے وہ جواب دکھایا ہے۔ جو اس کالج کے پرنسپل نے طلباء کے ریزولیوشن کا دیا ہے وہ لکھتا ہے۔ کہ عدم الحاق کی تحریک پولیٹیکل ہے۔ اور ہم امریکہ کے پادری ہیں اس لئے ہم اس میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اس جواب سے ظاہر ہے کہ چونکہ وہ سرکار کے مہمان ہیں۔ اس لئے ان سے بھلائی کی کوئی اُمید نہیں ہو سکتی۔

میڈیکل کالج کے طلباء سے خطاب

اس کالج کے طلباء یہ معقول اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اپنی تعلیم ختم کر کے ملک کی بہتر خدمت کر سکیں گے میں کہتا ہوں کہ میڈیکل کالج کے طلباء کی زیادہ تعداد فوج میں جاتی ہے۔ آج ملک کو تمہارے جیسے رنگروٹوں کی ضرورت ہے۔ اس میں

کالجوں کی کوئی تمیز نہیں پس تمہیں کالج چھوڑ دینے چاہئیں ٭

گورنمنٹ کالج کے طلباء کو مبارکباد

گورنمنٹ کالج کے یہاں قریباً ۱۵۰ طلبا موجود ہیں۔ میں انہیں دوبارہ زندہ ہونے پر مبارکباد دیتا ہوں (آوازیں آئیں ہم تالے توڑ کر آئے ہیں) اس سے ظاہر ہو گیا ہے کہ اس کالج کے طلبا بھی دیش بھگتی سے معمور ہیں۔ لیکن وہ ادھر ادھر کے بڑ بوڑھوں سے گر جاتے ہیں لیکن جب بڑے بڑے بوڑھے گر جاتے ہیں تو طلبا کو میں کیسے الزام دے سکتا ہوں میں ان سے یہی کہتا ہوں۔ کہ وہ اب تو تالے توڑ کر آئے ہیں۔ ویسے ہی انہیں غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہیے ٭

خالصہ کالج کے طلباء سے اپیل

خالصہ بھائیوں سے میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ علی الصبح گورو گوبند سنگھ جی کا ارادھن کیا کریں جنہوں نے اپنے دیش کے لئے اپنی تین نسلیں یعنی پتا بچے اور اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا دنیا بھر میں ایسی قربانی کی مثال نہیں مل سکتی۔ افسوس آج ان کے نام لینے والے تو چند نکمی آسامی پانے کے لئے اور جیبیں حاصل کرنے کے لئے خوشامدیں کرتے پھرتے ہیں۔ خالصہ نوجوانو! میرا اسوقت بھی یقین ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں تمہارے اندر زیادہ زندگی ہے پس آؤ گورو گوبند سنگھ جی کے سچے نام لیوا بنکر سوراجیہ کے علم بردار بنو ٭

جموں کالج کے طلباء کو ریاست میں واپس جانیکی ممانعت

مجھے بتایا گیا ہے کہ جموں کالج کے جو طلباء اس کانفرنس میں شامل ہوئے ہیں انہیں ریاست میں واپس جانیکی ممانعت کر دی گئی ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں میں انکے کھانے اور رہائیش کا ہر طرح انتظام کرونگا۔ انہیں ذرا بھی بد دل نہ ہونا چاہیئے ٭

قومی تعلیم

قومی تعلیم کے معنی کیا ہیں؟

جِس مضمون پر مجھے آپ کے سامنے اظہارِ خیالات کرنے کی اجازت ہوئی ہے۔ اِسپر کئی دفعہ وچار پرگٹ ہو چکے ہیں۔ مگر اُس کے بعض پہلو ایسے ہیں جن کو بیان کرنیکی مَیں کوشش کرونگا۔ ہمارے سامنے آجکل قومی تعلیم کا بیان ہے۔ اِس کے متعلق سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ راشٹر یا قوم کا ارتھ کیا ہے۔ جب تک اسکو نہ سمجھینگے ممکن ہے کہ ہم ایسے راستہ میں کہیں نہ کہیں غلطی کر جائیں۔ ہم کو بتایا جاتا ہے۔ کہ جہاں بہت سی نسلیں اور قومیں ہوں۔ وہاں قوم کا قائم ہونا ناممکن ہے۔ راشٹر کے لفظ کا اطلاق ایسی آبادی پر ہوتا ہے۔ جو جغرافیہ کے رُو سے مقررہ جگہ میں رہتی ہو۔ اِس کے متعلق دو خیال ہیں۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ قوم کا خیال بہت بُرا ہے۔ اِس سے نفرت پھیلتی ہے۔ اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ سب بھائی ہیں۔ اِس لئے سب سے یکساں سلوک کرنا چاہیئے۔ دُوسرے کہتے ہیں کہ اگرچہ سب بھائی ہیں۔ مگر جب تک ایک مُلک دُوسرے مُلک سے مختلف ہے تب تک ہم کو مان لینا چاہیئے۔ کہ قومیں جُدا ہیں۔ مَیں پہلے خیال پر کچھ نہ کہوں گا۔

دُنیا میں قومیں ہیں۔ ہم بھی ایک قوم ہیں۔ اِس لئے ہم کو قومی تعلیم کے سوال پر غور کرنا چاہیئے۔ آپ کو قوم یا راشٹر کا خیال مضبوط کر لینا چاہیئے۔ بہت لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان ایک قوم ہے۔ ہندو جُدا اور بدقسمتی سے سکھ ایک تیسری قوم ہے۔ اور اُن کے فوائد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اِس لئے جب کبھی ہم قومی تعلیم کے سوال پر غور کرتے ہیں۔ تو بہت سی مشکلات حائل ہو جاتی ہیں۔ جو چیز موجود ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو جانتے ہوئے مَیں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ سارے ہندوستان میں ایک ہی قوم اور راشٹر ہے۔ اور جب تک ہم اس بڑی راشٹر کے لئے ایسی شکھشا پرنالی نہیں بناتے۔ تب تک ہمیں آزادی نہیں مِل سکتی۔ جب تک ہمارا دیش اپنی حیثیت دُوسری قوموں کے مقابلہ میں پیدا نہیں کرتا ؎

دھرم کی پہلی پرکھ

اِس لئے میرے سامنے سب سے پہلی آزمائش اور پرکھ یہ ہے۔ کہ آیا یہ شکھشا ہم کو اِس قابل بنا دیتی ہے۔ کہ اس دیش میں اس قوم کے خیال کو مضبوط بنایا جاوے میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے۔ کہ آریہ ہندو مُسلمان اپنے مذہب کو چھوڑ دیں۔ میرا سدھانت یہ ہے۔ کہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ایسی شکھشا پرنالی قائم کریں۔ کہ جس سے راشٹر تعلیم کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اِس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اِس مُلک کے باشندے اِس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ کہ دھرم کیا ہے۔ دھرم وہ ہے۔ جو زندگی کا قانون ہے۔ دھرم وہ ہے جو زندگی کا قانون ہے۔ دھرم وُہ ہے جو ہم کو اپنا جیون دتیت کرنے کے قابل بنا دے۔ اگر کوئی دھرم دُنیا میں ایسا ہے جو قوموں کو آزادی کا سبق سکھاتا اور جب وہ غلام بن جاویں۔ تو وہ آزاد ہونے کی شکھشا نہیں دیتا۔ وہ دھرم۔ دھرم نہیں ہے۔ جو دھرم منشوں کو سوادھین ہونا نہیں سکھلاتا۔ وُہ دھرم دھرم نہیں ہے۔ جو سوراجیہ کا راستہ نہیں بتلاتا۔

اس واسطے جب میں دھرم کا چنتن کرتا ہوں۔ تو میں مت متانتروں کا مقابلہ کرتا ہوا
اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں۔ کہ یہ دھرم کہاں تک آزاد رہنا سکھلاتا ہے +

میرے لئے دھرم کی پہلی پرکھ یہی ہے۔ کہ آزادی کا سبق دے۔ اور مجھے خوشی ہے
کہ اسی پرکھ میں ہمارا آریہ دھرم سب سے اونچا ہے۔ یہ دھرم ہم کو آزاد ہونا سکھلاتا
ہے۔ اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا رستہ بتلاتا ہے۔ متر سے امتر سے پورب سے
اور پچھم سے ادھر سے ادھر سے ابھے ہونا سکھلاتا ہے۔ ہمیں رشیوں کا دھنیواد کرنا
چاہئے۔ کہ جنہوں نے ہمیں یہ دھرم پردان کر دیا۔ مجھے اس بات کے کہنے میں ذرا بھی
سنکوچ نہیں۔ کہ آریہ دھرم ہم کو آزادی کی تعلیم دیتا ہے۔ انیہ جاتیوں کے دھرموں میں
بھی آزاد ہونے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مگر اس پہلو میں آریہ دھرم سب سے اونچا ہے +

قومیت کی پہلی شرط

راشٹریتا یا قومیت کی پہلی شرط یہ ہے۔ کہ سکھ۔ ہندو۔ مسلمان میں کوئی تمیز نہ ہو۔
ہندوستانی کی حیثیت سے ہم سب ایک رہیں۔ کوئی شخص اس کے خلاف نہ جاوے۔ قوموں
کی زندگی میں بہت سے سمے ایسے آئے ہیں۔ جبکہ قومیں اپنے آپ کو تباہ کر لیتی ہیں مصیبت
کے وقت میں امریکہ نے ایک لازمی قانون بنایا۔ کہ وہاں کا ہر ایک شخص اپنی مرضی کے
خلاف جنگ میں جاوے۔ قوم کے فوائد کے لئے ویکتیوں کا دھرم بھی قربان کر دیں اس
کو تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر دیں۔ وہ سمے بہت بھیڑ کے سمے ہوتے ہیں مصیبت کے
سمے دیش کے نشان بدل جاتے ہیں۔ ابھی آپ کو بتلایا گیا ہے۔ کہ ہمارے دیش میں آگ
لگی ہوئی ہے۔ ایسے حالات میں ضروری ہے۔ کہ سب سے پہلا درجہ اپنی قومیت کو دیں
اس کے بعد قومی تعلیم کا سوال خود بخود حل ہو جائیگا۔ ابھی آپ کو بتلایا گیا ہے۔ کہ اس
وقت جو سرکاری تعلیم دیجاتی ہے۔ وہ کس قدر ہماری قومیت کا خون کرتی ہے سوچو کہ
اور کس طرح یہ ہو سکتا تھا۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو۔ کہ ایک غیر قوم ہزاروں کوسوں سے آکر

نہیں ایسی تعلیم دیتی - کہ جس سے ہماری آنکھیں کھل جائیں - اور ہم اُس کو نکال دیتے۔ قوموں کے اتہاس میں کوئی ایسی قوم دکھائی نہیں دیتی - کہ جو بے غرض ہو کر کام کرے۔ حاکم قوموں کا پہلا کام یہ ہوتا ہے - کہ رعایا کے دل پر قبضہ کیا جاوے - بہت سی قومیں تلوار سے قبضہ کرتی ہیں - مگر پولٹیکل دُنیا میں دانائی اس میں ہے - کہ بغیر تلوار کے دلوں پر قبضہ کیا جاوے ۔

ڈیڑھ سو سال ہوئے جب کہ ہندوستان میں گورنمنٹ نے اپنا سلسلۂ تعلیم قائم کیا اُنہوں نے اپنا منشاء صاف طور پر بتلا دیا - کہ ہندوستانی دلوں کو قابو کیا جاوے تاکہ وہ ہمارے ساتھ مل جاویں - ساتھ ملانے کا مطلب یہ تھا - کہ وہ ہمیشہ یہ سمجھتے رہیں کہ ایک غیر قوم کے ہم ماتحت رہیں - اور ہم پوجا کریں ۔

سب سے بڑا پرچار اس تعلیم کا یہ ہے - کہ وہ ہم کو بھائی سے بھائی کو جدا کرتی ہے - اور ہم اس قابل نہیں رہے - کہ اس کو اُٹھا کر باہر پھینک دیں - میں بحیثیت ایک پورانہ آریہ سماجی ہونے کے کہہ سکتا ہوں کہ وہ شخص جس نے اس مضمون پر سب سے پہلے روشنی ڈالی وہ رشی دیانند تھا - اور لوگوں نے بھی سوچا ہے مگر جس خوبی سے سوامی دیانند نے اس کو پیش کیا - اور کسی نے نہیں کیا ہے - بہت سے بھائی ستیارتھ پرکاش سے خفا ہو جاتے ہیں - لیکن اگر کسی کے دل کا بھاؤ دیکھنا ہو تو آکی پرارتھنا کو دیکھو - پلیٹ فارم پر کی گئی پرارتھنا پر بھروسہ اور وشواس نہیں کرنا چاہیئے بلکہ کسی کی پرکھ اس کی ایسی پرارتھنا سے کرو - جو کہ وہ پرماتما کے سامنے بیٹھ کر کرتا ہے اس لئے اگر سوامی دیانند کے ہردے کو دیکھنا ہے - تو دیکھو آریہ بھونے کو جس میں وہ سوراجیہ اور چکرورتی راجیہ کی پرارتھنا کرتے ہیں - ان کی آتما کا فوٹو لینا ہے تو آریہ بھونے کو دیکھو - کتنا وشال ہردے تھا - کس طرح دیش کی حالت پر روتا تھا کیا تم خیال کرتے ہو - کہ جس نے دُنیاوی جاہ و حشمت پر لات ماری ہو جس نے

یوگ کے آنند پرلات ماری ہو۔ ایک منٹ کے لئے بھی آرام کر سکتا ہے مترو! اگر آپ کو اپنے دیش سے پریم ہے تو دیش کی حالت ایک منٹ کے لئے بھی اجازت نہیں دیتی کہ سکھی بیٹھے سکیں۔ جبکہ دوسری جاتیاں ہم کو غلام ہونے کی وجہ سے حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ ہمارا دھرم ہمیں یہ سکھلاتا ہے۔ کہ جو شخص ہمارا ناش چاہتا ہے اس کو بھی متر کی درشٹی سے دیکھیں۔ مگر اپنا ناش نہ ہونے دیں۔ ہم کسی کی ہنسا نہ کریں گے لیکن اگر اپنے بچاؤ میں ہنسا ہے۔ تو ہم سب سے بڑھ کر اہنسا کرتے ہیں۔ ہم کسی کو اجازت نہ دیں گے۔ کہ کوئی شخص ہم کو پاؤں میں روند سکے۔ پورے طور پر قومی تعلیم نہیں پھیل سکتی۔ جب تک گورنمنٹ اپنی نہ ہو۔ قومی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ماں باپ سے نہیں۔ بلکہ راجہ کی طرف سے لازمی ہو۔ یہی طریقہ ہے جس پر یورپ کی زندہ جاتیاں عمل کرتی ہیں۔ دیکھو ستیارتھ پرکاش کو جس میں وہ لکھتے ہیں۔ کہ راجہ کی طرف سے حکم ہو۔ کہ سات سال کے بعد کوئی بچہ گھر میں نہ رہنے پاوے۔ ایسی حالت میں راشٹر ہی یہ کام کر سکتا ہے۔ کہ ایسی شکھشا دے۔ کہ اس میں ترقی نہ رہ جاوے۔ اور راشٹر اپنے ملک میں شکھشا کا پربندھ بلا فیس کے کرے۔ پراچین کال میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ اگر کسی اشد ... شکل میں۔ ماتا پتا دکھتی روپیہ سے اپنے بالک کی شکھشا کا پربندھ ... ... روپ سے جو شکھشا دیجا سکتی ہے۔ وہ ماتا پتا نہیں دے سکتے۔ ورتمان سمے شکھشا اپنے بالکوں کو اس قابل نہیں بناتی۔ کہ وہ اپنی قوم کو بچا سکیں اور ترقی دے سکیں تو وہ شکھشا نہیں۔ جب یورپ کو پتہ لگا۔ کہ جرمنی کی شکھشا بڑھ رہی ہے۔ تو انہوں نے موزلے کمیشن کے نام سے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے جرمنی اور دوسرے ملکوں کی تعلیم کا مطالعہ جا کر کیا۔ اور پھر رپورٹ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیس کروڑ روپیہ ترقی تعلیم کے لئے منظور کیا گیا۔ اب یہ کام ایک آدمی نہیں کر سکتا بلکہ کہا گیا ہے۔ کہ قومی تعلیم ہندی زبان میں ہونی چاہیئے۔ بہت درست ہے ...

مُلک کے نوجوان ولائت اور امریکہ جاتے ہیں۔ مگر ان میں اتنی تمیز پیدا نہیں ہوتی۔ کہ ایک کسان کو تعلیم دے سکیں۔ جو تعلیم اِتنا بھید پیدا کر سکتی ہے۔ اس کو حاصل کر کے ہم کس طرح آزاد ہو سکتے ہیں۔ جو کچھ گورو کل کر رہا ہے۔ وہ مُبارک ہے لیکن قومی تعلیم کا پُورا انتظام اُسی وقت ہوگا۔ جبکہ گورنمنٹ اپنی ہو جاوے گی +

لارڈ مکارلائل نے کہا تھا۔ کہ اگر کسی قوم کی آئندہ ترقی کا اندازہ لگانا ہو۔ تو اُس کی پاٹھ شالاؤں میں جا کر دیکھو۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا۔ کہ چونکہ ہماری گورنمنٹ اپنی نہیں۔ اس لئے ہمیں بھی کوشش چھوڑ دینی چاہیئے۔ یہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی قائم رہنی چاہیئے۔ ایک دن آوے گا۔ کہ یہ ٹمٹماتی روشنی سوراجیہ کی بڑی روشنی میں ملجاوے گی +

غلامی کی زنجیروں کو توڑدو

لیکن سب سے بڑی ضرورت یہ ہے۔ کہ ہم ان زنجیروں کو توڑ کر ایک بار سوراجیہ میں لگ جاویں۔ میں نہیں کہتا۔ کہ انگریز اس مُلک سے نکل جائیں۔ بیشک رہیں۔ مگر حاکم بن کر اب وہ نہیں رہ سکتے۔ مُلازم بن کر یا دوست بن کر رہ سکتے ہیں۔ ہمارے دیش میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس لئے ہر ایک ہندوستانی کے تن بدن میں سوراجیہ کی آگ لگ جانی چاہیئے۔ کوئی دھرم سنتر نہیں رہ سکتا جس دیش میں پرتنترتا بیشتی راجیہ ہو۔ تمہاری سمادھی ٹھیک نہیں رہ سکتی ... جبکہ صبح تو سندھیا اور دوپہر کو عدالت میں جا کر کہو۔ ہم راجیہ بھگت ہیں۔ جس مُلک میں بڑے بڑے دیش بھگتوں کی آتما کا خون ہوتا ہو۔ اس میں چلن کی پوترتا نہیں رہ سکتی۔ اِس دیش میں ہندو ہندو نہیں اور مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا۔ جب تک اس کو یہ آزادی حاصل نہیں۔ کہ جو کچھ اس کے دل میں آتا ہے۔ وہ کہدے۔ چالیس برس تک ہم مِتروں سے بھی ڈرتے رہے۔ اور اپنوں سے بھی ڈرتے رہے۔ بیس سال پہلے آریہ سماج سے گورنمنٹ ڈرتی تھی مگر ۱۹۰۷ء کے بعد اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ گیدڑوں کی سبھا ہے۔ ... [illegible]

کے غلط منتر یاد کر لئے اور اُپدیشک بن گئے۔ اگر چاہتے ہو۔ کہ وید کا پرچار ہو۔ تو نڈر اور بیخوف ہو کر سچائی کا اظہار کرو۔ کرشن بھگوان بھی کہتے ہیں۔ کہ دوستوں اور دشمنوں دونوں سے اندر نہ مانگو۔ کتنا اونچا معراج ہے۔ مگر ہم نے اس مہابیہ کی چوٹی میں بیٹھ کر اس معراج کو گرا دیا ۔

میرے بھائیو اور عزیزو! خود ممبروں کی جے پکارنے سے کچھ نہ بنے گا۔ پہلے اپنی جے مناؤ۔ مگر یہ اُس وقت ہو سکے گا۔ جب تک تم محسوس کرو گے کہ ہم پاپ کے راستہ سے نکلکر دیش سیوا کی جے منانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ہم نے بہت دنوں تک منتر پڑھے۔ آیتیں پڑھیں۔ لیکن اب جب تک ان کا فائدہ تمہارے سے پورہ ہو سکے گا۔ ان کا کچھ فائدہ نہ ہوگا جس راستہ پر پڑے ہو اسی پر دوڑتے ہو جاؤ۔ لیکن اس وشواس سے کہ کٹھن راستہ ہے۔ یہ بچار پو اتم کٹھن تپسیا میں ڈالے گئے ہو۔ لیکن ابھی اس سے بھی کٹھن راستہ پر تم کو چلنا ہوگا۔ تمہارے ماتا پتا نے تم کو پندرہ سال کے لئے یہاں بھیجا ہے۔ تمہارا دیش تمہیں ہمیشہ کے لئے تمہارے ماتا پتا سے حاصل کرنا چاہتا ہے ۔

استریوں سے پرارتھنا

ماتاؤ! سُنا کرتے تھے کہ جب اس دیش پر کبھی مصیبت آئی تو ماتاؤں نے اس کو دور کرنے کے لئے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ دیویو! تمہارے دیش پر اس وقت سخت سنکٹ آیا ہوا ہے۔ تم اپنے پتروں اور بھائیوں کو اشیرباد دو۔ کہ وہ دیش سیوا کے راستہ میں سب سے آگے بڑھیں۔ تم انہیں صاف شبدوں میں کہہ دو کہ اس دھرم یدھ میں پیچھے نہ ہٹو جس پرمیشور نے پہلے تمہارے ستیہ کی رکھشا کی ہے وہی اب بھی کرے گا۔ ان کمزور ہاتھوں سے رکھشا نہ ہوگی۔ مردوں کی طرح دھرم اور بھائی پر قربان ہونا تمہارا بھی کرتویہ ہے۔ اس مصیبت کے سمے میں آ کے بھی

اشیرواد کی ضرورت ہے۔ اپنے پتروں اور بھائیوں کو کھلے دل سے اشیرواد دو۔ اِس دیش میں ایسی ماتاؤں کی ضرورت ہے۔ جو بہت سے گاندھی اُتپن کر دیں۔ وہ گاندھی جو اِس دیش کا سنکٹ دُور کرنے کے لئے دن رات تڑپتا رہتا ہے ✣

آخری نویدن

میں اب زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ اسادھارن سمے ہے۔ دیش میں چاروں طرف ماتم چھا رہا ہے۔ ماتم جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کے لئے نہیں۔ وہ تو امر ہو گئے بلکہ ماتم اُن کے لئے ہے جو غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اِس لئے ضرورت ہے کہ دیش دھرم پر سوراجیہ کے دھرم پر مضبوطی سے قدم رکھو۔ پاؤں کٹ جائے مگر قدم پیچھے نہ ہٹے ✣

گاندھی کی ٹوپی یا محض کھدر پہن لینے سے دیش آزاد نہ ہوگا۔ جب تک تم یوں کو آزاد نہ کرو گے۔ اگر تم نے اس موقعہ پر اپنی بُزدلی یا کسی لالچ سے سوراجیہ کے راستہ سے قدم پیچھے ہٹایا۔ تو نہ صرف تم غلامی کی موت مرو گے۔ بلکہ اپنی آنیوالی نسل کے لئے طوق غلامی ورثہ میں چھوڑ جاؤ گے۔ سوراجیہ کا راستہ تپسیہ کا راستہ اور تپشیا سے کلیان کا راستہ ہے۔ تمام فروعی اختلافات اور جھگڑوں کو قربان کر کے اِس راستہ میں لگ جاؤ۔ یہی میرا انتم نویدن ہے ✣

کیا دُنیا صرف دولتمندوں کے لئے ہے؟

دُنیا کا موجودہ سوشل نظام ایسا بنا ہُوا ہے جس سے دولتمندوں اور صاحبِ زمین و جائداد اشخاص کو غریب و مزدوری پیشہ جماعتوں کے مقابلے میں بہت سے فائدے پہنچ رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا صرف معدودے چند آدمیوں کے آرام و آسایش و فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے۔ دُنیا کی زبردست دولتمند قومیں دُنیا کی غریب اور زیردست قوموں کو لُوٹ رہی ہیں۔ جس قدر کوئی قوم دولتمند ہے۔ اُسی قدر اُس کے پاس مزید دولت پیدا کرنے کے وسائل ہیں۔ دولت ہی اِس زمانہ میں طاقت کا معیار ہے۔ دولت کو سائنس سے اور سائنس کو دولت سے بہت کچھ مدد ملی ہے اور اِسی واسطے زمانۂ حال کی تہذیب کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے۔ انسانی دماغ کے بہترین نتائج دولتمند و طاقتور قوموں نے غریب و کمزور قوموں کو زبون کرنے اور اُن کو لُوٹنے میں استعمال کئے ہیں۔ پُرانے زمانہ میں عموماً شمال سے زبردست اور طاقتور نسلیں زبردست اور طاقتور لیڈروں کی ماتحتی میں اُٹھتی تھیں اور دُنیا میں چاروں طرف تاخت و تاراج کرکے اپنی حکومت کا سکّہ جماتی تھیں۔ چنگیز خاں اور تیمور کی

طاقت کا راز اُن کی علمیت - قابلیت ذہنی - سائنس دانی یا دولتمندی نہ تھا بلکہ اُن کی جسمانی طاقت اور بہادری - برعکس اس کے زمانہ حال میں طاقت کی بُنیاد دولت و علمیت پر ہے - زمانہ سابق کے لُٹیرے برملا لوٹ مار کرتے تھے - اُن کی لوٹ مار میں کوئی باریکی نہ تھی - وہ بیرحم تھے لیکن کھُلے بیرحم تھے ؂

اُن سے بچنے کے لئے لوگ جنگلوں - پہاڑوں اور دیگر مشکل گذار مقامات میں پناہ لیتے تھے - اُن میں سے بھی گاہے گاہے کوئی اکبر پیدا ہو کر اپنی رعایا کے لئے باعث امن ہو سکتا تھا - زمانہ حال میں طاقت کی بُنیاد بدل گئی - اب طاقت کی بُنیاد دولت اور علمیت پر ہے - بہادری نہیں - آجکل بہادری کا پیمانہ وہ آتش فشاں پہاڑ ہیں - جو میلوں کے فاصلہ پر بیٹھے ہوئے زن و مرد کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور ان کے بدن کے ٹکڑوں کو میلوں تک اُٹھا کر پھینک دیتے ہیں - آجکل طاقت کا معیار وہ بم ہے جو ہوائی جہازوں سے معصوم خلقت پر گرائے جاتے ہیں - اور جن سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہیں - اِن ہتھیاروں کے سامنے بہادر سے بہادر اور جانباز سے جانباز انسان ویسا ہی لاچار ہے جیسا کہ ایک معصوم بچّہ اور ایک ضعیف و ناتوان بوڑھا یا ایک حاملہ عورت - یہ تمام ہتھیار دولت سے بنائے جاتے ہیں اور دولت سے خریدے جاتے ہیں - آجکل کی دولتمند قومیں ان دولت سے خریدے ہوئے اور علمیت سے بنائے ہوئے ہتھیاروں کے ذریعہ قوموں کو شکست دے کر اور اُن کو لاچار کر کے پھر دولت و علمیت سے اُن کا خون چوستی ہیں - آہستہ آہستہ جو کچھ اُن کے پاس ہے یا جو وہ کماتے ہیں - وہ ان تہذیب یافتہ وحشیوں کی جیب میں چلا جاتا ہے - اور طرفہ یہ ہے - کہ یہ دولتمند و عالم قومیں نہ صرف خود تہذیب یافتہ ہونے کا دم بھرتی ہیں - بلکہ یہ بھی دعوے کرتی ہیں - کہ خداوند زمین و آسمان نے دُنیا کو تہذیب یافتہ و شائستہ بنانیکا مشن اُن کے

سپرد کیا ہے۔ اور وہ اپنے خونی ہتھیاروں کے استعمال سے اور اپنے عالمانہ ہتکنڈوں سے غریب اور مغلوب قوموں پر احسان کرتے ہیں۔ آج کل صرف یہ حال ہی نہیں کہ "زبردست مارے اور رونے نہ دے"۔ بلکہ مارے اور احسان کرے والا معاملہ ہے۔ اس سوشل نظام کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی خلق خدا خواہ وہ یورپ میں ہو یا ایشیا میں۔ امریکہ میں یا افریقہ میں اس تہذیب کے ہاتھ سے نالاں ہے۔ اس تہذیب نے عیش و آرام کا جو سامان پیدا کیا ہے۔ وہی عام خلقت کی بربادی اور تباہیت کا باعث بن رہا ہے۔ ایشیا نے تاریخ کے مختلف زمانوں میں یورپ کے نشانات تک پر قبضہ پایا اور اس کو لوٹا۔ اب یورپ کی باری ہے۔ یورپ قریباً ڈھائی سو سال سے سود در سود وصول کر رہا ہے اور ایشیا کی مختلف قوموں کو لوٹ رہا ہے۔ مگر یورپ خود بھی آرام میں نہیں ہے۔ یورپ میں ہمیشہ جنگ و جدل ہوتا ہے اور طاقت کی میزان بدلتی رہتی ہے لیکن قریباً دو سو سال سے طاقت دو تین دولتمند ہوشیار اور کثیر التعداد اقوام کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ سارے یورپ کو جس طرح چاہیں ناچ نچا رہے ہیں۔ برطانیہ کلاں اپنی دولت و علمیت کی وجہ ان اقوام میں ممتاز ہے۔ جرمنی بھی اپنی علمیت کی وجہ سے دولتمند اور طاقتور رہ چکا تھا۔ مگر اس گذشتہ جنگ نے اس کو تباہ کر دیا۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اب جرمنی مردہ اقوام کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ فرانس گذشتہ دو سو سال میں عجیب عجیب قلابازیاں کھاتا رہا۔ مگر اس وقت وہ یورپ کی چھاتی پر سوار ہے۔ اس دولت و علمیت نے یورپ کو طاقتور اور حکمران بنا دیا۔ لیکن وہ طاقت و علمیت صرف دو تین اقوام اپنے فائدہ کے لئے استعمال کر رہی ہیں اور اس کے ذریعہ دوسروں کو تباہ و برباد اور ذلیل کر رہی ہیں۔ جس طرح بین الاقوام کا یہ حال ہے۔ اسی طرح قوموں کے اندرونی نظام میں بھی یہی اصول کام کر رہا ہے۔ دولتمند آدمی

اپنی دولت کے ذریعہ غریبوں کو تباہ و ذلیل کر رہے ہیں۔ دولت سے دولت بڑھتی ہے اور غربت سے غربت۔ جو دولتمند ہے وہ زیادہ دولتمند ہوتا جاتا ہے۔ اور جو غریب ہے وہ زیادہ غریب ہوتا جاتا ہے۔ غریب کے لئے دولتمند ہونے کے موقعے تو نہایت ہی کم ہیں۔ البتہ ایک دولتمند کے لئے دوسرے دولتمند کے ہاتھوں غریب ہو جانے کے موقعے بہت زیادہ ہیں۔ حکمران قوم کے دولتمند تاجر و کارخانہ دار اُس حد تک ہندوستانی دولتمندوں و تاجروں کے مددگار ہیں۔ جس حد تک یہ مدد اُن کی دولت میں بیشی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ دونوں اپنی منفعت اغراض کے لئے اپنی دولت و علمیت کو غریبوں کو زیادہ غریب بنانے میں استعمال کرنے سے پہلو تہی نہیں کرتے۔ غریبوں کے پاس جو کچھ ہے (محدود) تو سوائے جسمانی محنت کے اور کچھ نہیں ہوتا اس کو مختلف ہتکنڈوں سے لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن بدن اشیاء مزدوری کی قیمت بڑھتی جاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں مزدوری کی شرح کم ہوتی جاتی ہے۔ مزدوری کی شرح ظاہرا تو بہت بڑھ رہی ہے۔ لیکن جو مزدوری اس وقت ملتی ہے۔ اس میں خریدنے کی طاقت اُس مزدوری سے بہت کم ہے۔ جو سابقہ مزدوری میں تھی۔ میں گذشتہ موسم سرما میں ٹاٹا نگر میں گیا تھا۔ جہاں بمبئی کی مشہور پارسی کمپنی نے ایک بڑا بھاری لوہے کا کارخانہ جاری کیا ہے۔ وہاں اب بھی عام طور پر مردوں کی مزدوری پانچ آنہ یا چھ آنہ روز سے زیادہ نہیں ہے۔ اِسی طرح کوئلہ کی کانوں میں بھی ابھی تک ایسی ہی شرح مزدوری کی ہے پنجاب میں بلاشبہ مزدوری معقول ہے تاہم اگر غور سے مزدوروں کی مزدوری اور قیمتوں کی بیشی کا مقابلہ کیا جائے گا۔ تو معلوم ہو جائیگا کہ اس بیشی سے مزدوروں کی مالی حالت میں بہت کم فائدہ ہوا ہے۔ تعلیمیافتہ مزدوروں کا تو نہایت ہی بُرا حال ہے جس کلرک یا بابو کو پہلے پچاس روپے ماہوار ملتے تھے۔ اِس کی تنخواہ میں اسقدر بیشی نہیں ہوئی جس قدر کہ اُس کے اخراجات ہیں۔ تعلیم یافتہ مزدوروں کی حالت

ناگفتہ بہ ہے۔ اُن کا سٹینڈرڈ زندگی اُونچا ہو گیا ہے۔ اُن کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ ان کی ضرورتیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ مگر اُن کی مزدوری اور آمدنی کمی پر ہے۔ اس پر بھی گورنمنٹ دولتمند۔ ساہوکار۔ کمپنیوں کے مالک۔ صاحبان اراضی لوگ اس امر کے دعویدار رہیں۔ کہ وہ اپنی دولت کو بڑھانے کے ذرائع ایجاد کرنے سے ان غربا پر احسان کر رہے ہیں۔ احسان یہ ہے کہ وہ ان کو زندہ رہنے کا موقع دیتے ہیں۔



موجودہ غلامی کے لئے غیر معمولی علاج کی ضرورت

ہلکر کا دہ کرنا نشیہ کا ساد ھارن دھرم ہے۔ مگر سنسار میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جبکہ معمولی علاج کارگر نہیں ہو سکتا۔ طبیب کو بھی پرانی بیماری کے لئے غیر معمولی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ ہماری غلامی کی بیماری بہت پرانی ہو گئی ہے۔ اسکا علاج مہاتما گاندھی نے عدم تعاون تجویز کیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی علاج ہے لیکن شفا بخش ہے؛

ہم نے ایک سو سال تک اپنے حاکموں کے ساتھ میل ورتن کیا۔ جو انہوں نے کہا اسکو سچ سمجھا اور جہاں ان کے اقرار پورے نہ ہوئے۔ وہاں ان کی توجہ ان وعدہ خلافیوں کی طرف دلائی۔ جنگ میں جو خدمت ممکن ہو سکتی تھی کی۔ لیکن جنگ کے ختم ہونے کے دو ماہ بعد ہی ہم کو معلوم ہو گیا۔ کہ جن کے لئے ہم نے خون بہایا تھا۔ ان کو ہم پر اعتبار نہیں اور چھ ماہ کے بعد یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا۔ کہ اگر ہم آزادی کے خواہاں ہوں تو ہم کو کیڑے مکوڑوں کی طرح پاؤں کے نیچے کچلا جا سکتا ہے۔ یہ سبق ہم کو جلیاں والے باغ۔ گوجرانوالے لائل پور اور دیگر مقامات میں حاصل ہوا؛

ہم کو کہا جاتا ہے۔ ہم پرانی کہانی کو بھول جائیں۔ لیکن یہ نہیں جتلایا جاتا۔ کہ اس ظلم

کے کرنے والوں کے دلوں میں کسی قسم کی پشیمانی پیدا ہوئی ہے۔ اور نہ ہم کو یہ یقین ہے۔ کہ بغیر سوراج حاصل کرنے کے پھر ڈائر اور او ڈوائر شاہی نہ ہوگی (اس پر شیم شیم کے نعرے بلند ہوئے) ؀

آپ ظالموں پر شیم شیم کرتے ہیں۔ ظالم تو ظلم کریگا ہی۔ اس کو کچھ کہنا لاحاصل اور بے معنی ہے شیم کرو اُن پر جنہوں نے ظالموں کو ظلم کرنے دیا۔ ظالم ہی دنیا میں ظلم کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ بلکہ مظلوم بھی جو ظالم کو ظلم کرنے دیتا ہے جب میں نے امریکہ میں سُنا کہ امرتسر کی لاکھوں کی آبادی میں سے اُس آبادی میں سے جو بہادری کا دم بھرتی ہے۔ صرف ایک رتن دیوی نکلی جس نے پُرانی آریہ دیویوں کی طرح اپنی جان اور عزت کو ہاتھ میں لے کر اپنی بنیتوں کو قائم رکھا۔ تو مارے غیرت کے میری پیشانی پر پسینہ آگیا۔ مارے شرم کے میرا سر نیچا ہو گیا ؀

کیا ان بہادروں میں سے دس میں بھی ایسے آدمی نہ نکل سکتے تھے جو اپنے تڑپتے ہوئے بھائیوں کو جاکر پانی دیتے اور ان کے آخری لمحوں کی تکلیفوں کو کم کرتے ؀

آپ دوسروں پر شیم شیم کرتے ہیں۔ لیکن کس نے ہمارے آدمیوں کو ہتکڑیاں لگائیں کس نے ان پر گولی چلائی۔ کس نے ان کو بید لگائے۔ کیا یہ انگریز تھے۔ اگر یہ انگریز نہیں تھے بلکہ ہندوستانی تھے۔ تو قابل شرم ہمارا رویّہ تھا۔ اور ہم کو اپنے گریبان میں مُنہ ڈالکر اپنے پر افسوس کرنا چاہیئے۔ ہم اپنے عیش و آرام میں محو ہیں۔ ہم کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ دُوسروں کی تکلیف کو محسوس کریں۔ جب تک ہماری عزّت قائم ہے۔ جب تک ہمارے آرام میں کسی قسم کا خلل واقعہ نہیں ہوتا ہم خوش ہیں۔ مگر صاحبانِ دولت اور خوشحالی اُس کے پاؤں چومتی ہے۔ جو اپنی عزّت کی رکشا کر سکتا ہے۔ جس طرح افرادی طور پر ہر ایک شخص آپ اپنی عزّت کا پاسبان ہوتا ہے۔ اسی طرح قومی طور پر ہر قوم کو اپنی عزّت کی آپ نگہبانی کرنی ہوتی ہے ؀

مہاتما گاندھی کی طبابت

مہاتما گاندھی نے بیماری کو جڑوں سے اکھاڑنے کا علاج پیش کیا ہے۔ وہ اصولوں کو لے رہے ہیں۔ اور جب تک اس غلامی کی جڑیں نہ کٹیں گی تب تک آزادی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ آزادی ایک نعمت بے بہا ہے۔ مگر اسکو حاصل کرنا ایک ننگی تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔

انگریز فرشتے نہیں۔

نابل ورتن کے اصول کو سب درست تسلیم کرتے ہیں۔ جو قوم ایک بیرونی حکومت کو قناعت سے تسلیم کر لیتی ہے وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ انگریز کوئی فرشتے نہیں۔ یہ اگر اتنی دور سے یہاں آئے ہیں تو محض اپنے فائدے کے لئے۔ وہ قدرتی طور پر اپنی بھلائی کو سب سے پہلے مدنظر رکھیں گے۔ ہاں جس طرح ایک آقا اپنے غلام کو خوراک اس واسطے دیتا ہے کہ وہ اس کی دن رات خدمت کر سکے۔ اسیطرح انگریز ہم کو وقتاً فوقتاً کچھ دے سکتے ہیں۔ تاکہ ہم ان کی خدمت کرتے رہیں۔ اور ان کے خزانوں کو بھرتے رہیں۔

مگر ہم گورنمنٹ کو یہ صاف بتا دینا چاہتے ہیں۔ کہ اگر وہ یہاں حکومت کرنا چاہتی ہے تو ہماری مرضی سے ہمارے منشاء کے مطابق۔ اگر یہ نہ ہوگا تو ہم اپنی معاونت کا ہاتھ ہٹا لیں گے۔ ہم اپنی موجودہ گورنمنٹ کے سامنے صرف دو ہی راستے پیش کر سکتے ہیں۔ یا تو اس ملک کی حکمرانی ہماری مرضی کے مطابق ہو یا ہمارے سروں پر راستہ کر کے حکمران ہو۔ دونوں طرح ہماری فتح ہے۔ آخری حالت میں بھی دنیا یہ تو کہیگی کہ انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں ناکام ہوئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ ہمارے آدمی گورنر ہو گئے اور وزیر بن گئے۔ اب اور کیا چاہیئے۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ گورنر اور یہ وزیر ہمارے نوکر ہوں نہ کہ انگریزوں کے۔
اس وقت بہار کا گورنر سب سے زیادہ تشدد کر رہا ہے۔ انگریز ہوشیاری سے یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے سر پر ہندوستانیوں سے ہی جوتیاں لگوائیں لیکن ہم اس غلطی میں نہیں آسکتے۔ ہم اس تمام تشدد کو ان شخصوں کو ہی منسوب کریں گے جو ان ہندوستانیوں کی حرص بھری طبیعت اور عہدوں کی خواہش سے فائدہ اٹھا کر ان کو اپنا زرخرید غلام بنا لیتے ہیں۔ اور پھر ان سے ہر قسم کے تشدد کی امید رکھتے ہیں۔ جب تک اس تشدد کے اصلی منبع کو بند نہ کر دیں۔ ہم کو صبر نہیں کرنا چاہئے ۔

یہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے

جبر و تشدد سے نہیں بلکہ پُرامن عدم تعاون سے۔ جن محکموں سے اشتراک عمل کرنے سے گورنمنٹ کو تقویت پہنچتی ہے۔ ہم کو اُن سے اپنا ہاتھ کھینچ لینا چاہئے کسی بھی گورنمنٹ سے پورا عدم تعاون نہیں ہو سکتا۔ خاص کر ایک ایسی گورنمنٹ سے جس نے ہماری زندگی کے ہر کام پر اپنا جال بچھایا ہوا ہو۔ ہوا۔ پانی اور روشنی تک کو اپنے ہاتھ میں کر لیا ہو۔ لوگ طنزاً کہتے ہیں کہ اگر سرکار عدم تعاون کے حامیوں کو ریل پر چڑھنے نہ دے یا ڈاکخانہ میں اُن کے خطوط نہ لے تو ایک دن میں ہوش آجاوے کاش گورنمنٹ ایسا کرے ہماری مُنہ مانگی مراد ملے۔ مگر گورنمنٹ ایسی بیوقوف نہیں۔ اور نہ ہم ناممکن باتوں پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہم اس وقت یہ کہتے ہیں کہ گورنمنٹ کا استحکام عدالتوں سے ہے۔ ان کا کام چھوڑ دو۔ وکیل وکالت چھوڑ دیں۔ خطاب وار اپنے خطابوں سے دست بردار ہو جاویں۔ سودیشی کا پرچار رہے۔ اور پنچائیتیں ہمارے تنازعات کا فیصلہ کریں ۔

کیا عدم تعاون ناکامیاب ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ وکیلوں نے وکالت نہیں چھوڑی۔ لڑکوں نے کالج

نہیں چھوڑے۔ اور خطاب داروں نے خطابوں کو ترک نہیں کیا۔ اِس لئے یہ تحریک ناکامیاب ہوئی ہے لیکن یہ بات ہے محض چھ ماہ کے عرصے میں یہ تحریک تمام ملک میں بجلی کی طرح پھیل گئی کسی اور تحریک نے کسی ملک میں اس تیزی سے کامیابی حاصل نہیں کی۔ نراٹن اپدیش ایک مانسک اوستھا ہے۔ اگر ملک میں مانسک اوستھا کی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ تو یہ تحریک ناکامیاب نہیں ہوئی۔ اگر آدمی سینکڑوں کی تعداد میں بے خوفی سے یہ کہنے کے لئے اور اس کے لئے تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار ہیں کہ وہ موجودہ گورنمنٹ کے وفادار نہیں۔ اگر آدمی اپنا ڈیفنس بھی پیش نہیں کرتے اور خوشی خوشی سے قید خانے میں جا رہے ہیں۔ تو کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملک میں ایک نئی رُوح پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ اِس عدم تعاون کا نتیجہ ہے۔ اگر عدم تعاون ناکامیاب ہوا ہے تو گورنمنٹ کیوں اِتنے پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ اور کیوں آدمیوں کی زبان بندی ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ کا موجودہ تشدد بذاتِ خود اسبات کا ثبوت ہے کہ یہ تحریک کامیاب ہوئی ہے۔

مدرسوں اور عدالتوں پر گورنمنٹ کا انحصار

آپ نے کہا کہ تعلیمیافتہ جماعت ایک نئی ذات کی طرح ملک میں پیدا ہو گئی ہے اُن کی تعلیم نے اَن پڑھوں اور پڑھے لکھوں میں تفاوت پیدا کر دی ہے۔ اِسی جماعت سے ہمارے انتظامیہ افسر بنتے ہیں۔ جو ہم پر تشدد کرنے لگتے ہیں۔ گورنمنٹ کے تمام محکمے اسی جماعت کے آدمی چلاتے ہیں۔ یہ وکیل بن کر بیرونی قانون کو تقویت دیتے ہیں۔ اب سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مقدمات کا فیصلہ کسی بیرونی گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہو۔ پہلے ہماری پنچایتیں ہمارے فیصلے کیا کرتی تھیں۔ اب وہ تمام نیست و نابود ہو گئی ہیں۔ اسلئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی پنچایتیں قائم کریں۔ اور قومی مدرسے کھولیں۔

فوج اور خزانہ گورنمنٹ کے استحکام کے لئے ضروری ہیں

جب تک ہمارا خزانہ ہمارے ہاتھ میں نہ ہو اور ہم جس کو چاہیں نوکر رکھیں۔ اور جسکو چاہیں موقوف کریں یا جب تک ہماری اپنی فوج نہ ہو جس کے افسر بھی ہندوستانی ہوں تب تک سوراجیہ حاصل نہیں ہو سکتا +

محدود وقت میں سوراجیہ

آدمی مخول کرتے ہیں کہ محدود وقت میں سوراجیہ کس طرح مل سکتا ہے۔ ہمارے جیسے اپاہجوں کے لئے اور غلامی کی زندگی بسر کرنے والوں کے لئے اس قسم کا خیال ظاہر کرنا جائے تعجب نہیں۔ مگر جن کو آزادی سے پیار ہے جو اس کی قدر کرتے ہیں۔ وہ امید رکھتے ہیں۔ اگر آپ کمر ہمت باندھ لو تو شاید بہت جلد سوراجیہ ہی مل سکتا ہے مجھے یقین ہے کہ اس عرصے میں یا تو سوراجیہ مل جاویگا یا ملک کے تمام لیڈر قید میں پڑے ہونگے۔ یہ بھی آپ کی ایک فتح ہوگی۔ بہر حال جو قدم اب آگے اٹھیگا وہ سوراجیہ ملنے پر ہوگا۔

گورنمنٹ کے قول و فعل میں اختلاف: - اس گورنمنٹ پر ہمکو اعتماد نہیں۔ پہلے گورنمنٹ یہ کہا کرتی تھی کہ شراب خواری خراب ہے۔ مگر اب جبکہ شراب بند ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ تلملا رہی ہے اور مقدمے چلا رہی ہے +

مقدمے بازی: - گورنمنٹ ہم پر طعن کیا کرتی تھی۔ کہ ہندوستان کے آدمی مقدمہ باز ہیں یہ اپنے گھر میں آپ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ وکیل بھی اسکے مورد عتاب تھے لیکن اب جبکہ ہم پنچایتیں قائم کرتے ہیں۔ تو انکو ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی وکیل وکالت چھوڑتا ہے تو اسکو برا سمجھا جاتا ہے

مدرسوں کی تعلیم: - گورنمنٹ کے افسران انگریزی تعلیم کے عام طور پر مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پڑھ کر لوگ نوکریوں کے پیچھے پھرنے لگ جاتے ہیں۔ اب جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ انگریزی تعلیم حاصل نہ کرو اور سرکاری ملازمت نہ کرو۔ تو گورنمنٹ کے افسران لال پیلے ہو رہے ہیں +

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ گورنمنٹ چاہتی ہے [illegible]

سوراجیہ کا دھرم

سجنو! اس وقت میں آپ کے سامنے مختصر تقریر کروں گا۔ آپ کو تین موٹی موٹی باتیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ملک کا ایک ایک بچہ اس بات کو سمجھ لے کہ اس دیش میں صرف ایک ہی دھرم ہے۔ اور وہ سوراجیہ کا دھرم ہے میں آپ کی توجہ بھگوان کرشن کے اس اپدیش کی طرف دلاتا ہوں جس میں انہوں نے کہا تھا "میرا بھگت میرے پاس آئیگا۔" اب مجھے کوئی کرشن نظر نہیں آتا۔ مگر ہاں ایک جہاں چیز ہے جو آج آپ کو کہتی ہے کہ "دیش بھگت میرے پاس آئیگا" اور وہ دیش بھگتی ہے اس دیش بھگتی کو گرہن کرو تب ہی سوراجیہ حاصل کر سکوگے۔ آپ کو پنڈت جی نے بتلایا کہ جو جاتی بندھنوں میں پڑی ہے وہ دنیا کی نظروں میں نیچ ہے۔ سچ ہے۔ باہر دیشوں میں ہم کو لوگ برٹش انڈین (British Indian) کے نام سے پکارتے ہیں۔ لوگ ہمیں ہندوستانی نہیں کہتے۔ کیونکہ ہم دوسری جاتی کے آدھین ہیں۔ ہمارے پاؤں میں غلامی کی بھاری بھاری بیڑیاں پڑی ہیں۔ ہم اس سمے تک ہندوستانی نہیں کہلا سکتے جب تک ہمارے ساتھ شبد برٹش لگا رہے گا اس شبد برٹش کو دور کرو۔ کوئی آدمی کنیڈا کے رہنے والوں کو برٹش کنیڈین نہیں کہتا۔ شبد برٹش اڑانے سے یہ مراد نہیں ہے۔ کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائیں

وہ بے شک رہیں مگر ایک شرط پر۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمارے دوست بن کر رہیں۔ نہ کہ ہمارے حاکم۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے قومی جذبات کو کچل ڈالیں۔ اور وہ کچل بھی ڈالتے ہیں۔ کیونکہ وہ طاقتور ہیں یہ طاقت بے سود ہو جائے گی۔ جب لوگ پورے اسہیوگی بن جائیں گے۔ ہم اپنے حقوق سوراجیہ ضرور لیں گے۔ چھین لیں گے۔ بھیک نہیں مانگتے۔ بھکشا مانگنے سے تو ہمیں چھوٹی چیزیں ہی ملیں گی۔ بھلا کبھی جہاں چیز جس کو آزادی کہتے ہیں کبھی بھکشا مانگنے سے مل سکتی ہے؟ (آواز۔ ضرور لیں گے اور لیکر آرام لیں گے) آج تک ہم مانگتے رہے۔ اب چھین لیں گے۔ اب ہم مورکھ نہیں رہے اگر شکتی نہیں رہے (قہقہہ) یاد رکھو جو لوگ ہمیں سوراجیہ لینے سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اِن کی طاقت کو کمزور کر دینگے۔ میرے عزیز بھائی نے آپ کو اسہیوگ کا دھرم بتلایا۔ سکولوں کے لڑکوں کا سکول یا کالج چھوڑ دینا وغیرہ وغیرہ ہی صرف اسہیوگ نہیں ہے۔ اسہیوگ یہ ہے کہ جس سہیوگ سے گورنمنٹ چلتی ہے۔ اس کو ہٹا لیں یہ گورنمنٹ یا اس کا کوئی محکمہ مثلاً فوج۔ پولیس۔ دیوانی عدالتیں تعلیم۔ غرضیکہ کوئی محکمہ ہماری مدد کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اسہیوگ اس بات کی منادی ہے کہ ہم آہستہ آہستہ اس تمام سہیوگ کو ہٹا لیں گے۔ حاکم کہتے ہیں اسہیوگ کامیاب نہیں ہوا۔ وہ خوب ہے۔ میں ہر بار گورنمنٹ سے پوچھتا ہوں اگر اسہیوگ کامیاب نہیں ہوا۔ تو دمن ہم کی ضرورت آن پڑی کیا۔ ہے خبر مرے ہوئے چوہے کو مارنے کے لئے اتنی بڑی گورنمنٹ کی ساری طاقت درکار نہیں۔ وائسرائے سے لیکر ایک سارجنٹ تک سب ہمارے برخلاف کونٹر پروپیگنڈا (Counter propaganda) میں لگے ہیں۔ اور اسہیوگ کی طاقت کو روکنا چاہتے ہیں کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہماری تحریک بجلی کا اثر رکھتی ہے۔ صاحبان! میں نے دنیا کی تاریخ کا خوب مطالعہ کیا اور جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے۔ خود ذاتی تجربہ ہوا۔ میں اس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ کسی مفتوح

قوم کی ایک تحریک کو ایسی شاندار کامیابی ایک نہایت ہی قلیل عرصہ میں نہیں ہوئی۔
جیسی ہماری اسہیوگ کی تحریک کو۔ بالفرض اگر یہ تحریک ناکامیاب ہوگئی ہے تو کیوں
نہیں باہر میدان میں نکلتے اور لیکچر دیتے۔ آؤ لوگوں کو اپنی طرف کر لو۔ آپ کو معلوم
ہو جائیگا۔ کہ اس تحریک کی فتح ہوئی ہے یا شکست۔ ہم ستیہ پر قائم ہیں۔ اس سچائی کی طاقت
کے سبب سے ہم (Counter-propaganda) کو خوش آمدید کہتے
ہیں۔ کیونکہ اس سے ہماری بعض کمزوریوں کے رفع ہو جانے کی توقع ہوگی۔ اگر ہم میں
کوئی کمزوری ہو۔ ہماری ستیہ کی تحریک تشدد سے نہ دبے گی۔ میں لاف زنی نہیں کرتا
سچ تو یہ ہے کہ ہم لاف زنی کر ہی کیا سکتے ہیں جنہوں نے ۱۵۰ برس سے بغیر کسی قسم کے
(Resistance) کے دوسروں کے آگے سر جھکائے اور جوتیاں کھاتے
رہے۔ مگر اب ہم نے ایسا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس واسطے ہماری تحریک تشدد سے نہیں
دب سکتی۔ ہم نے آگے بہتیرا مانگا جب تک مانگا کچھ نہ ملا۔ ہاں لعنت ملی۔ مگر اب جب اس
دیش میں ایک ایسی جماعت بن گئی جو مانگنے کو برا سمجھتی ہے۔ تو وہی بھیک منگے اچھے
ہو گئے اور دوست بن گئے۔ مسٹر چنتامنی کے لئے میرے دل میں بہت عزت ہے۔ وہی
چنتامنی جس کی بابت مسٹر مسٹن نے کچھ لکھا تھا آج ۱۹۲۰ء میں اس قدر لائق ہو گئے کہ
وزیر بن گئے۔ ان کی لیاقت بیس سال بعد معلوم ہوئی۔ یہ نان کواپریشن کے کرشمے
ہیں۔ خیال کرو۔ وہی ہرکشن لال جو پچھلے سال باغی تھے۔ جن کو عمر قید بعبور دریائے شور
کی سزا ہوئی۔ ضبطی جائداد کا حکم دیا گیا۔ آج اس قدر لائق ہو گئے کہ وہ بھی وزیر بن گئے
یہ کیا ہے؟ سب اسہیوگ کی برکت ہے۔ بدیشی گورنمنٹ کے ماتحت ایک دیش بھگت کا
عہدہ قبول کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ ہم اپنے دھرم پر قائم نہیں رہ سکتے۔ میں ان پر
بد دیانتی اور بے ایمانی کا الزام نہیں لگاتا۔ میں اس کو ایک کمزوری سمجھتا ہوں۔ اس
واسطے جب میں یہ واقعات بیان کرتا ہوں۔ تو مت سمجھو کہ میں خوش ہوں۔ میں نادم

ہوں۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ ۱۹۲۱ء میں بھی باوجود گذشتہ ۱۹۲۰ء کے ایسے لوگ موجود ہیں جو گورنمنٹ سے کوآپریشن کر سکتے ہیں اور اس کو اپریشن کرنے کو اپنا دھرم سمجھتے ہیں اس پر سوائے ہمارے شرمندہ ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

کہتے ہیں گورنمنٹ کے افسر یہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستانی شراب نہیں پیتے ہیں بہت خوب۔ دوکانیں خود کھولتے ہیں۔ خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔ اور الزام ہم پر لگاتے ہیں میں اس کو تسلیم کرتا ہوں۔ مگر جب ہم نے شراب ادھی کو بند کرنا چاہا۔ تو ہمارے ہی تشدد سے اس تحریک کو روکنا جائز قرار دیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ حقیقت میں شراب کا بیوپار چاہتی ہے۔

دوسری بات ہم کو کہا جاتا تھا۔ تم بڑے مقدمہ باز ہو۔ وکیلوں کو جیبیں بھرتی تھیں۔ مگر اب جب ہم نے لوگوں کو مقدمہ بازی سے پرہیز کرنے کے لئے کہا۔ اور وکیلوں کو وکالت چھوڑنے کے لئے کہا تو ہم پر الزام دیا اور ہماری خواہش ہے کہ وکیلوں پر عاشق ہو گئے۔

تیسری بات۔ ہم کو یہ طعنہ دئے جاتے تھے کہ ان موجودہ سکولوں میں لڑکے صرف نوکری کی خاطر پڑھتے ہیں۔ "پائنیر" کی فائل میں کالم کے کالم اس طریقہ تعلیم کو برا کہنے میں ملیں گے۔ مگر جب ہم نے اس کو برا کہنا شروع کیا تو یہ اچھی ہو گئی۔ (ہنسی Laughter)

جب ہم کو یہ کہا جاتا ہے کہ بہت تھوڑے وکیلوں نے وکالت چھوڑی اور بہت تھوڑے لڑکوں نے کالج چھوڑے۔ وہ لوگ بھول کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہم نے ان دونوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔

اسہیوگ شانتی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسہیوگ چاہتا ہے کہ آپ نڈر اور سچے ہو جائیں حصول آزادی کے لئے جیل خانہ جانا بڑی بات نہ خیال کریں۔ ہم جیل جانے سے

ڈرتے ہیں۔ مگر جب سوراجیہ کے لئے۔ دیش بھگتی کے لئے جیل کو تیرتھ کے برابر سمجھ
لو گے تو دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت بھی تم کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتی
سوراجیہ مل جائیگا۔ اسوقت جبکہ ہر شہر میں جیل خانے پولیٹیکل قیدیوں سے بھرے جائینگے
ایک ایک جیل کی جگہ دس دس جیل بنانے پڑیں گے۔ (بندے ماترم) ہم سرکاری خطابات
کی عزت کو لوگوں کے دلوں سے دور کر دیں گے۔ ہم ان جیلخانوں کے ڈر کو بالکل مٹا
دینگے۔ مہاتما گاندھی سچ کہتے ہیں "میں اس دن آزاد ہو جاؤں گا جس دن مجھے جیلخانہ
بھیجا جائیگا" (اللہ اکبر) ڈرنا برے کاموں سے۔ چوری سے، پاپی سے، مکاری و
بدکاری سے۔ مگر اپنی بھومی کی خدمت کے لئے ضروری ہے کہ نڈر ہو جاؤ۔ ابھی تو
ابتدا ہے۔ دیکھو آئندہ کیا ہوگا۔ ہم لوگ ستیہ وادی بن گئے ہیں ستیہ کے سامنے جھوٹ
روشنی کے سامنے اندھیرے کی طرح بھاگ جائیگا۔ میں ۱۹۱۸ء میں پہلے پہل کانگرس میں
گیا۔ وہاں جو ریزولیوشن پاس کئے جاتے تھے۔ وہ ڈر کر اور بڑے ہی ڈپلومیٹک طریقے سے
وہ ہماری کمزوری تھی۔ بزدلی تھی۔ اب ہماری سچائی نے واقعی بجلی بن کر دشمنوں کے
دلوں کو ہلا دیا ہے۔ اب گورنمنٹ پریشان ہے اور دفعہ ۱۴۴ کا خوب استعمال کر رہی ہے
یہاں تک کہ [illegible] اپنی بھی اس سے بری نہیں۔ (Laughter)
[illegible] لئے کہ انہوں نے بنا شادی۔ گورنمنٹ کی نظروں میں عزت کی [illegible] کی
پرواہ نہ کی۔ وہ [illegible] ہو گئے [illegible] ہے۔ اس لئے اسقدر زبردست گورنمنٹ بھی
ان سے ڈرتی ہے۔ بھائی وہ بھی کیا کریں مجھے ان کے حال پر بھی رحم آتا ہے انہوں
نے ایک بڑا نوالہ منہ میں ڈال لیا تھا۔ اب ان لوگوں کی نظروں میں وہ نوالہ آگیا ہے
اب وہ ہضم نہیں ہو سکتا۔ سنو! آزادی کے لئے سچے بن جاؤ۔ نڈر بن جاؤ۔ اس کے
لئے اسیوگ ہی ایک طاقت ہے۔ جو کام کر سکتی ہے۔ (بولو اسیوگ کی جے) اسلئے
وہ لوگ جو ملک کی آزادی چاہتے ہیں۔ اگر اسیوگ دھارن نہیں کرتے تو وہ ملک کے

ساتھ نہیں ہیں - آؤ آج پرتگیا کرو - اِس پرماتما کے سامنے جو راجہ اور پرجا کی پالنا کرتا ہے کہ سوراجیہ کی پراپتی تک ہم آرام نہ لیں گے - اور ہمہ تن مشغول ہو کر بہت جلد سوراجیہ حاصل کریں گے - بدیشی لوگوں کے جوٹھے ٹکڑے کھانے والو اپنے ملک کے لوگوں کو بھائی بناؤ - سمجھو کیونکہ اس دیش کا بچہ بچہ چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان - شودر ہو یا برہمن بھائی ہے - جب تک تم اِس اچھوت کو جاری رکھو گے - مگر مسٹر ٹامسن سے ہاتھ ملانے میں فخر سمجھو گے تب تک ہم اچھے سیوک نہیں بن سکتے - ہمارا مذہب نفرت نہیں سکھاتا ہمارا مذہب سب کو بھائی کہتا ہے - قائم رہو اپنے مذہب پر - اور اس اصول کو جہاں دوسری جاتی کے لوگوں سے برتتے ہو - اپنی جاتی کے لوگوں سے بھی برتو - جہاں میں اپنے دوستوں کے کمروں میں سارے دنیا بھر کے بادشاہوں اور شاید ہندوستان بھر کے سارے گورنروں کی تصویریں دیکھتا ہوں - مجھے شوک ہوتا ہے کہ ان کمروں میں سیواجی مرہٹہ یا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تصویریں نہیں ہوتیں - بھائیو! ان کا کیا قصور ہے - اِس بدیشی راج میں تو ہماری بدھی بھی بدیشی ہو گئی ہے - اس بدیشی بدھی کو سودیشی بناؤ - اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم بدیشی لوگوں سے کچھ نہ سیکھیں - سیکھو اچھی باتیں سیکھو - جب میں یہ کہتا ہوں - آپ کا دل تو ضرور دکھتا ہو گا - تمہارا ہی نہیں بلکہ جو اسکو پڑھیں گے اُن کا دل بھی دکھے گا - مگر کیا کروں ستیہ یہی کہتا ہے ٭

میری مائیو اور بہنو! اِس وقت ملک کو تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے - تیار کرو دھرم یدھ کے لئے اپنے بچوں کو - اپنے بھائیوں کو اور اپنے خاوندوں کو تا کہ جلدی سوراجیہ حاصل کریں اور آرام کی زندگی بسر کریں - یہی میری پرارتھنا ہے ٭

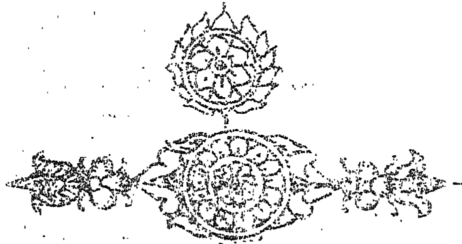
سوامی دیانند اور عدم تعاون

کسی سچے دیش بھگتی کے لئے یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ کسی غیر قوم کی گورنمنٹ کے ساتھ دیدہ و دانستہ تعاون کرے۔ ایک کمزور قوم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی کمزوری کا انوبھو کرتے ہوئے ایک زبردست گورنمنٹ کے برخلاف بغاوت کا جھنڈا بلند نہ کرے۔ لیکن کسی شخص کے لئے جو اپنے آپ کو دیش بھگت سمجھتا ہو یہ سمجھنا کہ کوئی غیر گورنمنٹ ان کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ اور اس کی ان کو مدد کرنی چاہئے۔ اپنے دیش کے ساتھ دروہی بننے سے کم نہیں۔ جس روز آریہ سماج میں داخل ہوا تھا۔ مجھ کو یہ یقین دلایا گیا تھا۔ کہ آریہ سماج ایک ایسی جماعت ہے جو اپنے دیش کا ہت چاہتی ہے۔ دیش ہت پولیٹکل آزادی کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ اور جس قدر میری عمر زیادہ ہوتی گئی۔ اسی قدر زیادہ میرا یہ وشواش بڑھتا گیا۔ کہ سوامی دیانند پورن دیش بھگت تھے۔ اور جب کبھی آئندہ زمانہ میں اس دیش کی آزادی کی تاریخ لکھی جائیگی تو سوامی دیانند جی کا نام ان اشخاص کی فہرست میں پرتھم شرینی میں درج کیا جائے گا۔ جنہوں نے انیسویں صدی میں اس دیش کو پرائے راج سے آزاد کرانے کی بنیاد ڈالی میرا یہ یقین ہے کہ مہاتما گاندھی کے اسہیوگ پروگرام میں ایک بھی خیال ایسا نہیں ہے جو سوامی جی مہاراج کی تعلیم میں نہ ملتا ہو۔ سوامی جی کی تعلیم کے بموجب آریہ سماجی لیڈروں نے سب سے اول اپنے قول و فعل سے اسہیوگ کی تعلیم دی۔ سودیشی کا پرچار کیا۔

گورنمنٹ کی ملازمت سے قوم کے بہترین دماغ کو آزاد رکھنے اور آزاد بنانے کی
کوشش کی۔ لوگوں کو سرکاری خطابوں سے اور دیگر ایسے اعزازی عہدوں کی طرف
سے بیزار رہنے کے خیال کا پرچار کیا۔ قومی تعلیم کی آزاد بنیاد کی۔ قومی زبان۔ قومی
لٹریچر۔ قومی تہوار۔ قومی کھیل کود۔ قومی بینک۔ قومی بیمہ کمپنیاں۔ قومی تجارتی
کمپنیاں بنانے کا خیال آریہ سماج نے پھیلایا۔ اور سب کچھ سوامی جی کی دی ہوئی
تعلیم کی بدولت کیا گیا۔

سوامی جی کی ستیارتھ پرکاش میں جو کچھ تعلیم پولیٹیکل نقطۂ خیال سے درج ہے
وہ مکمل آزادی کی ہے اور اسی کی بنیاد پر آریہ سماج کے انگریزی و ہندوستانی
بدخواہ آریہ سماج پر ایک باغی جماعت ہونے کا الزام لگاتے رہے ہیں۔ آریہ سماج
نے کبھی یہ جواب نہیں دیا کہ سوامی جی کی تعلیم غلط تھی۔ بلکہ ہمیشہ یہ جواب دیتی رہی
کہ آریہ سماج اپنی ذات سے کوئی پولیٹیکل جماعت نہیں ہے۔ اور یہ جواب ان معنوں میں
صحیح تھا اور ہے کہ سماجک حیثیت سے آریہ سماج نے کبھی عملی پالیٹکس میں حصہ
نہیں لیا۔ لیکن سوامی دیانند جی مہاراج کی تعلیم کا ایک ایک نقطہ خواہ ستیارتھ
پرکاش میں پڑھو۔ خواہ وید بھاشیہ میں دیکھو خواہ آریہ ابھی ونے میں دیکھو پولیٹیکل
آزادی کی خواہش سے لبریز ہے۔ اور وید بھگوان خود بھی جگہ جگہ پر آریوں کو اناریوں
سے چھٹکارا پانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ شاید تمام دنیا میں کوئی مذہبی کتاب ایسی کتاب
نہیں جو ایسے صحیح الفاظ میں اسہیوگ کی تعلیم دیتی ہو جیسے کہ اتھروید۔ آریہ گزٹ
مورخہ [illegible] پھاگن کے لیڈنگ آرٹیکل میں آریہ گزٹ کے ایڈیٹر نے جو پرمان سوامی جی
کی کتاب سے پیش کیے ہیں۔ وہ میرے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مگر
اس سے بہت زیادہ پرمان بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ انہی وجوہات سے یہ کہنا بالکل
بیجا نہیں۔ کہ سوامی دیانند سب سے زبردست پرچارک اسہیوگ کا تھا۔ اور اگر اس کے

بعض پیرو آج کمزوری یا بزدلی سے یا مصلحت سے یا لالچ سے ایسے گر گئے ہیں کہ انکے
دل میں سوراجیہ کا خیال اور اس کی ضرورت جگہ نہیں پکڑتی۔ اور وہ موجودہ گورنمنٹ
کے ساتھ چل کر ہی اپنی قوم کا بھلا کرنا چاہتے ہیں۔ تو سوائے افسوس کے اور کیا کہا
جا سکتا ہے۔ میں اپنی عمر بھر آریہ سماج کے لیڈروں سے اسہیوگ کی تعلیم پاتا رہا ہوں
میں اسہیوگ کو دھرم سمجھتا ہوں اور میرا یہ یقین ہے۔ کہ انگریزی لٹریچر میں آزادی
کے جاننے والوں کے لئے ایک غیر قوم کی گورنمنٹ سے اسہیوگ کی تعلیم بھری ہوئی
ہے کسی غیر قوم کی گورنمنٹ سے عزتیں حاصل کرنا اور اس کو مضبوطی دینا سیدھا دیش
بھگتی کے دھرم کے ورودھ ہے۔



آریہ سماج اور پالیٹکس

دھرم اور پالیٹکس۔ آریہ سماج اور نیشنل کانگرس

آریہ گزٹ کے شوراتری نمبر میں سب ہی مضمون نہایت اعلیٰ پایہ کے ہیں اور میں اپنے ناظرین کو اُن کی طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اِس وقت میں اس مضمون کا خاص نوٹس لینے کا ارادہ رکھتا ہوں جو عنوان مندرجہ بالا سے لالہ دیوانچند صاحب ایم۔ اے پرنسپل دیانند کالج کانپور کے قلم سے نکلا ہے۔ میں اِس مضمون کو کیوں خاص توجہ کے قابل سمجھتا ہوں۔ اِس کی کئی وجوہات ہیں۔ آریہ سماج پنجاب میں ایک جیتی جاگتی شکتی ہے۔ صرف پنجاب میں ہی نہیں۔ بلکہ ہندوستان بھر میں گذشتہ پانچ سال سے پہلے اگر کوئی آرگنزیشن ایسی تھی جس کو سچے معنوں میں آرگنزیشن کہنا چاہئے تو وہ آریہ سماج کی تھی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں جب میں پنجاب میں تھا تو میں نے ولایت کے مشہور ماہواری رسالہ کنٹمپریری ریویو کے لئے آریہ سماج پر ایک آرٹیکل لکھا تھا۔ تو میں نے اِس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ آریہ سماج سب سے بارسوخ اور سب سے زبردست آرگنزیشن ہے۔ اِس وقت ہندوستان میں اور کئی آرگنزیشن پیدا ہو گئی ہیں۔ جو اپنی متفقہ طاقت و رسوخ میں آریہ سماج سے بڑھ گئی ہیں۔"

مثلاً خلافت کمیٹی نیشنل کانگرس کمیٹی - ہوم رول . لیگ مگر تاہم مذہبی جماعتوں میں اب بھی آریہ سماج کا آرگنزیشن سب سے اعلےٰ پایہ کا اور نہایت بارسوخ ہے - پنجاب میں ایک وقت تھا - کہ ہندو سوسائٹی کا بہترین دماغ اور بہترین دل اس سماج میں شامل تھا - اب بھی اس سماج کے اندر صوبہ پنجاب کی بعض بہترین ہستیاں کام کر رہی ہیں - اس لئے آریہ سماجک خلاقوں کا اثر صوبہ کی مجموعی حالت پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا - لالہ دیوا چند کی ہستی خود آریہ سماج کے لئے اور دیش کے لئے قابلِ قدر اور قابلِ عزت ہے - وہ پنجاب کے برگزیدہ دماغوں میں سے ہیں مجھ سے کہیں زیادہ اُنہوں نے تعلیم پائی ہے - اور جو کچھ وہ کہتے یا لکھتے ہیں میں ہمیشہ اُس کو نہایت غور سے سنتا اور پڑھتا ہوں - مگر آرٹیکل متذکرہ بالا میں مجھے اصولوں کی چند غلطیاں نظر آتی ہیں - جن پر توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے - سب سے پہلے جو بھید دھرم اور پالٹیکس میں لالہ دیوا چند صاحب نے بتلایا ہے - وہ میری موٹی سمجھ میں نہیں آیا - لالہ صاحب فرماتے ہیں :-

(۱) پالیٹیکس کا تعلق اس لوک سے ہے - اور دھرم کا لوک اور پرلوک دونوں سے ہے ؛

(۲) دھرم آتما کی ابدی زندگی کی تعلیم دیتا ہے - موجودہ جنم کے کرموں کا پھل دھرم کے مطابق ہمیں کبھی آئندہ ملے گا - پالٹیکس ابدی زندگی کے سوال کو نہیں چھیڑتا ؛ ہمارے موجودہ کرموں کا پھل ہماری اولاد اور اُن کی اولاد کو بھگتنا پڑے گا - لیکن ہم خود اسی دُنیا میں یا کہیں اور ان کا پھل بھوگیں گے یا نہیں اس کے متعلق پالٹیکس خاموش رہنا چاہتا ہے ؛

(۳) دھرم کی بُنیادی تعلیم ایشور کی ہستی ہے - ہر ایک دھرم ایشور کی صفات بیان کرتا ہے - پالٹیکس کو اِن باتوں سے کچھ تعلق نہیں ؛

(۲) تمام دھرم اپنے پیروؤں کو تعلیم دیتے ہیں۔ کہ پرلوک سدھارنے کے لئے انہیں خاص کتابوں میں پرماتما نے ہدایتیں دی ہیں۔ پالٹیکس کہتا ہے مجھے پرماتما اور پرلوک سے غرض نہیں۔ میں الہامی کتاب کے وجود و عدم وجود کے متعلق کوئی وقت خرچ نہیں کر سکتا۔ پالٹیکس کا تعلق بھی لوک اور پرلوک دونوں سے ہے۔ جو کہتا کہ اس کا تعلق صرف اس لوک سے ہے میری رائے میں غلط ہے۔ پالٹیکس اس سائنس کا یا زندگی کے اس پہلو کا نام ہے۔ جو سوسائٹی کو انتظام میں رکھتا ہے۔ اس کی بیرونی اور اندرونی حفاظت کا انتظام کرتا ہے اور ہر طرح سے سوسائٹی اور سوسائٹی کے ہر فرد بشر کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ داری لیتا ہے۔ عام معنوں میں اور عام الفاظ میں پالٹیکس کے اصول عالمگیر ہیں۔ لیکن جب ہم اس لفظ کا اطلاق خاص قوموں یا خاص ملکوں پر کرتے ہیں تب وہ محدود ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی دھرم کے اصول بھی خواہ کتنے ہی عالمگیر ہوں لیکن دیش اور کال کی ضروریات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ جس قوم یا ملک میں پولیٹیکل مضبوطی یا پولیٹیکل صحت نہ ہو۔ اس میں دھرم کا پرچار نہیں ہو سکتا۔ لوگ دھرم پر نہیں چل سکتے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ ہر ایک فرد انسان ایک سوشل ہستی ہے اور محض اپنے لئے نہیں جیتا تو ظاہر ہو جائے گا۔ کہ ویکتی (فرد) کا سمشٹی (گروہ یا سوسائٹی) پر اور سمشٹی کا ویکتی پر کتنا گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کے سوشل قانون پالٹیکس میں شامل ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ زندگی ایک واحد اور ناقابل تقسیم امر واقعہ ہے۔ افراد کی زندگی اور سماج کی زندگی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دھرم زندگی کا قانون ہے۔ پالٹیکس اس کے ایک زبردست پہلو کا نام ہے۔ دراصل گہرے معنوں میں دونوں مترادف ہیں۔ دھرم کے ہر ایک نیتا نے سچے پولیٹیکل اصولوں کا پرچار کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ حضرت محمد۔ مہاتما بدھ۔ گورو گوبند سنگھ صاحب نے یہی ایسا کیا ہے۔ سوامی دیانند

نے بھی ایسا ہی کیا۔ چنانچہ آریہ سماج کے اصولوں میں یہ فقرہ پایا جاتا ہے "سارے سنسار کی اُنتی کرنا اس سماج کا مکھیہ اُدیش ہے۔ ارتھات شاریرک سماجک اور آتمک" لوگوں نے آتمک اُنتی کا نام دھرم قرار دیا ہے۔ اور سماجک کا نام پالیٹکس قرار دیا ہے لیکن اصل میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ کچھ صدیوں سے یورپ کے ودوانوں نے انسانی کانشنس (ضمیر) کی آزادی کے نام پر شخصی مذہبی رائے کو سٹیٹ یعنی گورنمنٹ کے کنٹرول سے نکال دیا ہے اور اس طرح مذہبی پرچار کو گورنمنٹ کے منطقے سے پرے کر دیا ہے لیکن یہ تمیز کیسی مشکل ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آہستہ آہستہ گورنمنٹوں نے دھرم کے مختلف محکموں پر دست اندازی شروع کر دی ہے۔ زندگی کے بہت سے پہلو جو پہلے دھرم کے ماتحت تھے اب سٹیٹ کے ماتحت آتے جاتے ہیں۔ اور مذہب کے معنے بہت محدود اور تنگ ہوتے جاتے ہیں۔ دھرم کا ترجمہ مذہب نہیں ہے۔ "دھرم" ایک بڑا عالمگیر شبد ہے۔ اور اس میں زندگی کے سب محکمے شامل ہیں۔ مذہب یا ریلیجن کے معنوں میں چند خاص سدھانتوں کے عقیدہ کا نام ہے جس کے لئے شاید لفظ "مت" بہتر ہو گا۔ کرم کے مسئلہ پر اگر پالیٹکس خاموش ہے تو صرف مصلحتاً ورنہ کرم کے مسئلہ پر انسانوں کی پولیٹکل اور اکانومک حالت کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے ابدی زندگی کیا ہے؟ کس کو کہتے ہیں؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کو میں اس وقت چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن موجودہ کرموں کا پھل ہماری اولاد کو اور ان کی اولاد کو بھگتنا پڑے گا یا نہیں۔ یہ سوال ایسا نہیں ہے جس کو پالیٹکس بالکل نظر انداز کر دے۔ مثلاً شادی کے یا تعلیم کے اصول جو مسلمہ طور پر پالیٹکس میں شامل ہیں۔ انگلینڈ کے مشہور سوشل فلاسفر کڈ نے اپنی کتاب میں ان پر بحث کی ہے*

لالہ دیوا چند صاحب فرماتے ہیں "دھرم کی بنیادی تعلیم ایشور کی ہستی ہے" یہ بھی مفروضات میں سے ہے۔ بدھ دھرم ایشور کی ہستی کی تعلیم نہیں دیتا یا کم از کم اس

سوال پر خاموش ہے۔ ہندو شاستروں میں چارواک یعنی ناستکوں کے دھرم کو بھی دھرم بتلایا ہے۔ ایشور کی کیا صفات ہیں؟ لوگ ایشور کو کیا مانتے ہیں؟ اس کا گہرا اثر انسان کی سوشیل حالت پر پڑتا ہے۔ اور سوشیل حالات کے اثر پالٹیکس کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں

لالہ دیواچند کا جو تھا اصول بھی اسی طرح بالکل درست نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ لالہ دیواچند نے "دھرم" اور "پالٹیکس" کے محدود معنے لئے ہیں۔ دھرم چند عقیدوں کا نام سمجھا گیا ہے اور پالٹیکس کا تعلق صرف گورنمنٹ کی قائم (صورت) سے سمجھا گیا ہے میرا اپنا یقین ہے۔ کہ گورنمنٹ کی فارم کا گہرا تعلق دھرم سے ہے۔ اور دھرم کا گہرا تعلق گورنمنٹ کی فارم سے ہے۔ آریہ سماج کے اصولوں میں وہ مصنوعی فرق اور وہ مصنوعی تمیز دھرم اور پالٹیکس میں قائم نہیں رکھی گئی ہے جس پر لالہ دیواچند کا سہارا ہے بہتر ہوتا اگر لالہ دیواچند یہ اصولی بحث نہ چھیڑتے کیونکہ مجھے اس امر کے ماننے میں ذرا بھی تامل نہیں۔ کہ آریہ سماج سماجک حیثیت سے رجیلیت یعنی بقول عام معنوں میں پولٹیکل جماعت نہیں ہے۔ مگر اس کا یہ سبب نہیں کہ آریہ سماج دھرم اور پالٹیکس میں کوئی اصولی فرق بیان کرتا ہے۔ یا آریہ سماج کے اصولوں میں کوئی ایسی تمیز کی گئی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ آریہ سماج نے اپنے سرکاری ملازم ممبران کی خاطر اور مصلحتاً اس تمیز کو اپنے عمل میں قائم کر دیا ہے جس وقت اس ملک میں ایک غیر قوم کا راج نہ رہا اسی روز آریہ سماج اس مصنوعی تمیز کو دور کر دے گا +

آریہ سماج اور نیشنل کانگرس کا جو بھید لالہ دیواچند نے بتلایا وہ بہت حد تک درست ہے۔ گو یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے۔ جو سماج ریاضی۔ تاریخ و جغرافیہ۔ پالٹیکس و اکنامکس۔ انگریزی۔ درزی گری۔ آیوروید۔ بڑھئی وغیرہ کی تعلیم دینا اپنا فرض سمجھتا ہے وہ کہاں تک یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ صرف ایک "دھارمک" جماعت ہے؟ ہم میں سے کسی نے کبھی یہ نہیں کہا۔ کہ آریہ سماج نیشنل کانگرس میں جذب ہو جائے۔

ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یا تو آریہ سماج تعلیم دینا چھوڑ دے۔ یا اگر تعلیم دینا اسکا فرض ہے تو وہ تعلیم سچی دے۔ جھوٹی نہ دے۔ ہمارا یہ عذر ہے کہ آریہ سماج اپنے تعلیمی کام سے اپنے دھرم کے برخلاف تعلیم دیتا ہے۔ آریہ سماج مندر میں آریہ سماج یہ سکھاتا ہے کہ وید الہامی کتب ہیں اور اِس میں سوائے سچائی اور ایک پرماتما کی پوجا کے اور کسی قسم کی تعلیم نہیں۔ دیانند سکول اور دیانند کالج کے احاطہ میں آریہ سماج لڑکوں کو یہ پڑھاتا ہے کہ ویدوں میں نیچر پرستی کی تعلیم ہے۔ وید دُنیا کی ابتدائی وحشیانہ زمانہ کی کتب ہیں اور ویدوں کے بنانے والے وحشی تھے۔ ان کو لکھنا تک نہ آتا تھا۔ وہ ننگے رہتے تھے اور گائے کا ماس کھایا کرتے تھے۔ شراب پیا کرتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ دیانند سکول اور دیانند کالج کے لڑکے امتحان پاس کرنے کے لئے اِس قسم کے جوابات لکھنے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ یہ تعلیم کس حد تک دھارمک تعلیم ہے یہ ہم لالہ دیوا چند و لالہ ہنسراج پر چھوڑتے ہیں۔ یہ صرف مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ دیانند سکول اور دیانند کالج میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور جو صرف اس واسطے پڑھائی جاتی ہیں۔ کہ یونیورسٹیوں کے ساتھ الحاق رکھنے کے لئے اُن کا پڑھانا لازمی اور ضروری ہے +

لالہ دیوا چند کا یہ بیان بھی غلط ہے۔ کہ آریہ سماج کا ادیش مقرر ہے اور نیشنل کانگرس کا نہیں۔ آریہ سماج کی نسبت نیشنل کانگرس کا ادیش زیادہ مقرر ہے۔ آریہ سماج کے ادیش کو آریہ سماج کے مختلف ممبر مختلف طور پر سمجھتے ہیں۔ رائے مولراج صاحب آریہ سماج کا وہی ادیش نہیں سمجھتے جو لالہ ہنسراج جی۔ پنڈت آریہ منی آریہ سماج کا وہی ادیش نہیں سمجھتے جو پنڈت بلاجا رام۔ لالہ دیوا چند آریہ سماج کا وہی ادیش نہیں سمجھتے جو لالہ گوبند رام +

بہتر ہوتا اگر لالہ دیوا چند صاحب فرما دیتے کہ آریہ سماج کا مقررہ ادیش اُن کی نظروں میں کیا ہے۔ اگر موجودہ نیشنل کانگرس نو مرم گوکھلے کی کانگرس نہیں ہے۔ تو موجودہ

آریہ سماج بھی رائے مولراج اور لالہ سائیں داس کی آریہ سماج نہیں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہنے کی دلیری کروں گا۔ کہ موجودہ آریہ سماج جو پارٹی پالیٹکس کے خیال سے بہت سے نازیبا کام کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ وہ سوامی دیانند کی آریہ سماج بھی نہیں۔ جس سماج نے سوامی دیانند کے بنائے ہوئے دھرم کو پس پشت ڈال کر کالج اور اسکولوں کو اپنے ایمان کا جزو بنا لیا۔ وہ آریہ سماج سوامی دیانند کی آریہ سماج نہیں ہے +

آریہ سماج اور قطع تعلق

آریہ سماج اور قطع تعلق کے متعلق بھی لالہ دیوا چند کے خیالات میں بہت کچھ تزلزل دکھائی دیتا ہے۔ میری پوزیشن کو انہوں نے صحیح بیان کیا ہے۔ میں اس کو پھر نقل کر دیتا ہوں +

”میں نہایت زور سے اور صدق دل سے یہ تحریر کرتا ہوں۔ کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اور لیڈران آریہ سماج نے شروع سے ہی گورنمنٹ کے ساتھ اَن کوآپریشن کے اصول کا پرچار کیا۔ سوامی جی کی تحریروں میں یہ اصول زور سے پایا جاتا ہے اور باقی لیڈر بھی قول اور فعل دونوں سے ۲۵ برس تک اسی اصول کا پرچار کرتے رہے گو ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ انہیں اپنے اصولوں پر عمل کرنے کی دلیری نہیں تھی +

لالہ لاجپت رائے جی کی پوزیشن یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء سے خاص کر انکی جلاوطنی کے بعد آریہ سماج اور دیانند کالج کو ایک نئی سڑک پر ڈال دیا گیا ہے۔ اور کالج میں حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سوامی دیانند کی سپرٹ کچل دی گئی ہے“ +

میں لالہ دیوا چند کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ لفظ ”کچل“ میرے قلم سے سہواً نہیں نکلا۔

دیانند سکول کو آزاد رکھنے کے لئے جو کوششیں بانیانِ کالج نے کیں وہ فعل میں
داخل ہیں۔ سرکاری امداد سے انکار کرنا۔ انسپکٹروں کو اپنے مدرسہ میں نہ آنے دینا۔
وظائف نہ لینا۔ گورنمنٹ میں اپنے لڑکوں کو نہ بھیجنا۔ اپنے بچوں کو حتیٰ الامکان ان
عملیات سے بچانا جس کو وہ درست نہ سمجھتے تھے۔ یہ سب فعل ہیں اور میں اس قسم کے
افعال کی بڑی لمبی فہرست دے سکتا ہوں۔ جن بزرگوں نے اپنے لئے قطع تعلق کو
وہ اہمیت نہیں دی جو اب ان سے منسوب کیجاتی ہے۔ وہی بزرگ آریہ سماج کو
اس غلط راستہ پر ڈالنے کے گنہگار ہوئے۔ میں اپنے آپ کو بزرگ نہیں سمجھتا مگر میں اپنے
گناہوں کی ذمہ داری قبول کرنے اور ان کے لئے پرائشچت کرنا اپنا دھرم سمجھتا ہوں
میرا یہ یقین ہے اور میں اپنے اس یقین کی دلائل ایک دوسرے آرٹیکل میں دونگا کہ آریہ
سماج نے اپنی تعلیمی پالیسی سے آریہ سماج کو کیسا سخت نقصان پہنچایا ہے اور پہنچا رہا
ہے اور جب تک آریہ سماج اس جنجال سے رہائی نہ پائیگا وہ اپنے اصلی کام کیطرف متوجہ ہوئے
عملی دقتیں بیان کرتے ہوئے لالہ دیوانچند نے بہت سے فرضی قلعے بنوا کر ان کو ڈھانے
میں بہت ہمت صرف کی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آریہ سماج
بحیثیت مجموعی پالٹکس میں حصہ لے۔ اگر تعلیمی کورس میں تبدیلیاں کرنا اور یونیورسٹی
سے قطع تعلق کرنا پالٹکس میں حصہ لینا ہے۔ تو یونیورسٹی کے ساتھ تعلق رکھنا اور اسقدر
سکول اور کالج بنانا بھی پالٹکس ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تعلیم کو پالٹکس سے جدا
کرنے کی کوشش کرنا عبث ہے۔ جو جماعت مذہبی تعلیم کو چھوڑ کر دنیاوی یعنی secular
دینے کا انتظام کرتی ہے وہ ضرور کسی حد تک بلکہ معقول حد تک پالٹکس میں حصہ لیتی ہے
میرا تو یہ دعوےٰ ہے کہ آریہ سماج کے پروگرام و اویش میں پولیٹکل آزادی شامل تھی اور
ہے۔ مگر آریہ سماج نے مصلحتاً مروّجہ پالٹکس کو اپنے احاطہ سے خارج رکھا ہے لیکن اسکے
تعلیمی اویش میں قومی آزادی شامل تھی۔ اب جبکہ تجربہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ آریہ سماج

کی گذشتہ تعلیمی پالیسی اس قومی آزادی کے مخالف پڑی تو اُس سے اپنی تعلیمی پالیسی کو تبدیل کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ مَیں نے کہیں نہیں کہا کہ آریہ سماج نیشنل کانگریس میں جذب ہو جائے یا تعلیمی پالیسی سے باہر بھی پولیٹیکل کام میں مصروف ہو جائے میرا تو یہ خیال ہے کہ آریہ سماج اپنے اعلیٰ ترین پالٹکس Politics کی تعلیم دیتی رہتی ہے۔ اس میں جو نقص آ گئے ہیں۔ اُن کو دور کر دیا جائے۔ پولیٹیکل پارٹیوں کا ذکر کرتے ہوئے لالہ دیوان چند ایک منٹ کے لئے آریہ سماج کی پارٹیاں بھول گئے۔ آریہ سماج میں پہلی پارٹی اس قدر اصولوں پر نہ تھی جس قدر دیانند کالج کے سبب سے تھی۔ لالہ دیوان چند شاید اس وقت بالک تھے اور اُن کو معلوم نہیں کہ دونوں پارٹیاں کس وجہ سے دو رُخ میں سے نکلیں۔ مَیں جانتا ہوں کیونکہ مَیں نے اس دو رُخی دور میں پورا حصہ لیا تھا۔

ممبروں کی شخصی آزادی۔ اس حصہ مضمون پر بھی مجھے بہت کچھ اعتراض ہے کیا لالہ دیوان چند کا یہ منشا ہے کہ اگر نیشنل کانگریس کسی اصول کا پرچار کرے اور وہ اصول آریہ سماج کے نزدیک درست ہو تو ہمیں اس کی پیروی نہیں کرنی چاہئیے۔ یا اس کی پیروی کرتے ہوئے نیشنل کانگریس کا حوالہ نہیں دینا چاہئیے۔ یہ ایک قسم کا تنفر ہے جو میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

لالہ دیوان چند نے جو تیسرا اصول وضع کی ہے۔ وہ بھی انوکھی ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں جہاں تک ایک آریہ سماجی کا فعل آریہ سماج کو بحیثیت جماعت کے الگ رکھتا ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے لیکن جہاں اس کا فعل آریہ سماج کو لپیٹ لیتا ہے آریہ سماج کا انٹرسٹ دیکھنا چاہئیے۔ آریہ سماج نے اپنے واحد ممبروں کو اپنے لئے پولیٹیکل راستہ چننے کی پوری آزادی دی ہے اور آئندہ بھی یہ آزادی دی جانی چاہئیے لیکن آریہ سماج کے ممبروں کو یہ حق نہیں کہ آریہ سماج کی سنستھا کو اپنے فعلوں سے کسی خاص سمت میں گھسیٹ لے جائیں۔ اگر ایک آریہ پالیٹکس میں بہت دلچسپی لیتا ہے

اور خاص پولیٹیکل خیالات کا پرچار کرنا چاہتا ہے۔ تو اُسے ایدیشنگ کا کام چھوڑ دینا چاہیئے +

اصول دہم اصل میں ایک پولیٹیکل اصول ہے۔ مذہب یا دھرم سے جن معنوں میں لالہ دیوانچند دھرم شبد کا استعمال کرتے ہیں۔ اُسے کچھ بھی سمبندھ نہیں۔ وہ اصول رائے منولراج صاحب نے جان اسٹوارٹ مل کی کتاب موسومہ لبرٹی سے لیا ہے۔ اسکے معنے یہ ہیں کہ شخصی آزادی صرف اُس حد تک جائز ہے جس حد تک اُس سے سوسائٹی کو نقصان نہ پہنچے جب سوسائٹی معرض خطر میں ہو تو سوسائٹی کے ممبروں کو اپنی کانشنس کے خلاف بھی کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق گذشتہ جنگ عظیم میں یوروپ اور امریکہ کی گورنمنٹوں نے اپنے ممبران کو اپنی کانشنس کے خلاف لڑائی میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ کسی دھارمک سوسائٹی کو اس اصول کی پیروی کی ضرورت نہیں کیونکہ دھرم میں پالیسی یا مصلحت کا دخل نہ ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی کام ادھرم نہیں ہے تو کسی دھارمک جماعت کا حق نہیں ہے۔ کہ وہ اپنے ممبران کو وہ کام کرنے سے روکے محض اس لئے کہ اس کے ایسا کام کرنے سے وہ گورنمنٹ وقت کے نزدیک مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ لالہ دیوانچند فرماتے ہیں کہ "اگر ایک ایدیشنگ پالٹیکس میں بہت دلچسپی لیتا ہے اور خاص پولیٹیکل خیالات کا پرچار کرنا چاہتا ہے۔ تو اُسے ایدیشنگ کا کام چھوڑ دینا چاہیئے" میری رائے میں یہ اصول بالکل غلط ہے اور اس پر عملدرآمد کرتے سے آریہ سماج اپنی دھارمک پدوی سے گر گیا ہے۔ اگر یہ اصول درست ہے جس کی پیروی کرتے ہوئے دیانند کالج کی مینجنگ کمیٹی نے "دیوتا سروپ" بھائی پرمانند کو بلا اُن کا جواب لینے کے موقوف یا معطل کر دیا تھا۔ تو پھر اب لالہ دیوانچند کیوں اُن کو آریہ سماج کے پلیٹ فارم سے لکچر دینے کے لیئے مدعو کرتے ہیں "دیوتا سروپ شری بھائی پرمانند" دو دفعہ انگریزی عدالتوں سے سخت سے سخت پولیٹیکل جرائم میں سزایاب ہو چکے ہیں۔ گو میری رائے میں دونوں

سوا ہیں غلط تھیں۔ تاہم آریہ سماج کے بہت سے دھارمک نیتاؤں نے بھائی جی کو عین مصیبت کے وقت میں اس طرح چھوڑ دیا جیسے کہ کوئی تندرست انگریز پلیگ کے مریض سے بھاگتا ہے۔

لالہ دیوان چند صاحب فرماتے ہیں:۔

"بعض لوگ یہ بھی مناسب سمجھتے ہیں۔ کہ آریہ سماج کے لیڈر پالٹیکس میں نمایاں حصہ نہ لیں۔ کیونکہ سوسائٹی کی موجودہ تعلیمی حالت میں سادھارن آریہ سماجی اُن کی زندگی کے دونوں پہلوؤں میں تمیز نہیں کر سکتے۔ میرا رجحان اس خیال کی طرف ہے۔ مگر میں اس پر زور نہیں دیتا۔"

کیا میں لالہ دیوان چند سے دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ کونسل کا ممبر بننا پالٹیکس میں نمایاں حصہ لینا ہے یا نہیں۔ کیا یونیورسٹی کمیشن کے سامنے گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی پر نکتہ چینی کرنا پالٹیکس ہے یا نہیں۔ کیا گورنمنٹ کے حق میں وفاداری کی پراتھنائیں کرنا پالٹیکس میں داخل ہے یا نہیں۔ کیا گورنمنٹ کی خاطر لڑنا پالٹیکس میں داخل ہے یا نہیں؟ کیا لالہ دیوان چند نے کبھی اپنی آواز اُن آریہ سماجیوں کے برخلاف بلند کی جو ایسا کرتے جا رہے ہیں۔ لالہ دیوان چند کے پالٹیکس میں صرف وہ فعل داخل ہیں جن کو گورنمنٹ وقت یا گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدیدار ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔ پالٹیکس کی یہ تعریف صرف اُن دماغوں سے نکل سکتی ہے جن کو پولیٹکل بیماری نے ٹھیک سوچنے کے ناقابل کر دیا ہے۔ لالہ دیوان چند کے پیراگراف نمبر ۵ و ۸ بہت معنی خیز ہیں۔ لالہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"جو گرہست کی عمر سے گذر چکے ہیں۔ وہ گھروں اور گھروں کے پریم کو چھوڑ دیں اس کے بعد پیشہ اور اپنے خاندان کے لئے کمانا بند کر دیں۔ اگر ان کا گذارہ [illegible] وہ کمائی کے بغیر ہو سکتا ہے تو ساری کمائی دان میں دیدیں۔ گرہستی

اپنے دان کو بہت بڑھا دیں۔ جن کو پرماتما نے توفیق دی ہے۔ وہ اس سال کی ساری کمائی دھرم اور دیش کے ارپن کر دیں۔ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملنا چاہیئے۔ کہ جو آریہ سماجی پالٹکس سے پرے رہتے ہیں۔ وہ دل کی کمزوری یا خود غرضی کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں ؀

آریہ سماج پنجاب میں ۱۸۷۷ء میں قائم ہوا۔ دیانند سکول پنجاب میں [illegible] میں کھلا اور دیانند کالج ۱۸۸۹ء میں۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے بموجب آریہ سماجیوں کی تعداد ہندوستان میں اڑھائی لاکھ سے دو چند تھی۔ آریہ سماج کی دھارمک کامیابی کا معیار اس تعداد سے ہونا چاہیئے۔ جو لالہ دیوان چند نے مندرجہ بالا اقتباس کے پہلے فقرہ میں درج کیا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ دیانند کالج اور آریہ سماج کا تعلیمی کام آریہ سماج کے دھرم پرچار میں بہت زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ لالہ ہنسراج اور لالہ دیوان چند کی نگاہوں میں کامیابی کا معیار مندروں کی تعداد، ممبروں کی تعداد، سکولوں کی تعداد اور پاس شدہ لڑکوں کی تعداد ہے۔ میرا معیار ان اشخاص کی تعداد ہے۔ جنہوں نے سچ مچ اپنی زندگی کو دھارمک بنایا۔ اور جو لالہ دیوا چند کے الفاظ میں "آریہ سماج کے عاشق" ثابت ہوئے۔ آریہ سماج نے سکولوں اور کالجوں کے عاشق پیدا کئے لیکن آریہ سماج نے آریہ دھرم کے عاشق پیدا نہیں کئے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ آریہ سماج نے اپنے دھارمک مشن کو یونیورسٹی تعلیم کے ماتحت کر دیا ؀

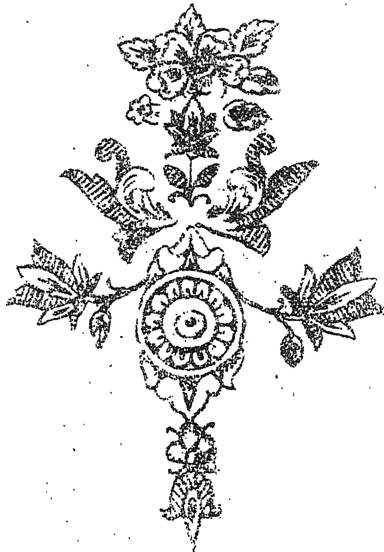
لالہ دیوا چند فرماتے ہیں کہ "آریہ سماج کے ممبر اس وقت تک آریہ سماج کو سب سے مقدم رکھتے رہے ہیں" میں نہایت ادب سے اس سے انکار کرتا ہوں۔ آریہ سماج میں ایسی ہستیاں ہیں جو آریہ دھرم کو اور آریہ سماج کو سب سے مقدم سمجھتی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ جس روز آریہ سماج کی تعلیمی پالیسی

آریہ سماج کے سچے عاشقوں کے ہاتھ میں آگئی - اسی روز آریہ سماج بے نظیر ہو جائے گا۔ اور اس پر کوئی اعتراض نہ ہو سکے گا۔

میں آخیر میں لالہ دیوانچند کو اور ان کے ہم خیالوں کو یہ بھی بتا دوں کہ ہم نیشنل کانگریس کا عاشق نہیں - جو اصحاب ہندوستانیوں کو یہ اپدیش کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے دلوں میں آریہ سماج کو یا نیشنل کانگریس کو اوّل درجہ دیں - اور ان جماعتوں کا عاشق بنا دیں وہ اپنے ملک اور اپنے دھرم کے ساتھ سخت بے انصافی کرتے ہیں - ہم کو آریہ سماج کے عاشق درکار نہیں - اس خیال نے آریہ سماج کو نہایت کمزور کر دیا۔ ہم کو آریہ دھرم کے عاشق درکار ہیں - اسی طرح ہم کو انڈین نیشنل کانگرس کے عاشق نہیں چاہئیں بلکہ ملک و قوم کے عاشق درکار ہیں - اگر آریہ سماجی آریہ سماج یا دیانند کالج کے عاشق ہونے یا پیدا کرنے کے بجائے آریہ دھرم کے عاشق بنائیں یا بنیں - تو اس میں ان کا کلیان ہے - اور دیش کا اور سنسار کا کلیان ہے - سماجوں و مندروں و کالجوں کا عشق جھوٹا ہے - صرف دھرم کا ہی عشق سچا عشق ہے - انسٹی ٹیوشنوں کے عشق نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا - اور یہ خیال جس قدر جلد چھوڑ دیا جائے اچھا ہے - آریہ لوگ دھرم کو مقدم سمجھیں نہ کہ آریہ سماج کو - سوامی دیانند نے بھی یہی اپدیش کیا - اور آریہ سماج کے اصول بھی یہی اپدیش کرتے ہیں - آریہ سماج کے عاشق اگر اپنا عشق دھرم سے رکھتے - تو جو مشکلیں آج ان کو دیانند کالج کی تنخواہوں کا پلیٹ دینے میں پیش آ رہی ہیں وہ پیش نہ آئیں - آریہ سماج و دیانند کالج بے شک ضروری جماعتیں یا انسٹی ٹیوشنیں اور سادھن ہیں - بذات خود اصول نہیں ہیں - اور نہ زندگی کا اودیش ہیں - اسی طرح نیشنل کانگرس بھی ایک ذریعہ اور سادھن ہے - بذات خود ہمارا معبود نہیں ہے - ہم کو پیارا ہے اپنا دیش سے اور اپنے دھرم سے۔

پیارے مترو! دھرم کے عاشق بنو - اسی سے تمہارا کلیان ہے - سوامی دیانند

کو جب معلوم ہوا کہ شومت کی سنستھا ان کے دھارمک سوراج پورا نہیں کرتی
انہوں نے فوراً اس کو چھوڑ دیا۔ ان کی اپنی زندگی میں بہت سے مندروں و مٹھوں
کی گدی پیش کی گئی۔ اور اس کے ساتھ لاکھوں روپیوں کی جائداد بھی مل رہی تھی۔
مگر اس نے ان سب پر لات ماری۔ کیونکہ اس کے دل سے مندروں و مٹھوں کے
سنستھاؤں کا عشق جاتا رہا تھا۔ وہ دھرم کا عاشق تھا۔ نہ کسی سماج یا سبھا یا
سمپردائے کا۔



اصلی قومیت وسوراج

ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں سے اپیل

ہندو قومیت ۔ مسلمان قومیت یا خالصہ قومیت کا خیال چھوڑ کر

سب ہندوستانی بن جاؤ

پنجاب کی تعلیمیافتہ جماعت میں بہت سے ایسے نیک نہاد محبان وطن ہیں جن کے دل میں یہ خیال گڑا ہوا ہے ۔ کہ ہندو و مسلمانوں و سکھوں میں کسی طرح اتفاق نہیں ہو سکتا ۔ اور ان کے انٹرسٹ ایکدوسرے کے متضاد ہیں ایک عرصہ ہوا جب اس تعلیم کی بنیاد ڈالی گئی ۔ اور نوجوان ہندوؤں ۔ نوجوان مسلمانوں اور نوجوان سکھوں کو یہ تعلیم دی گئی ۔ ہندوؤں کو ہندو قومیت مسلمانوں کو مسلمان قومیت اور سکھوں کو خالصہ قومیت کا سبق پڑھایا گیا میں اس امر پر بحث نہیں کروں گا ۔ کہ جس وقت یہ تعلیم دی گئی ۔ اس وقت اس کی ضرورت تھی یا نہیں میں اس امر پر بھی بحث نہیں کروں گا ۔ کہ اس تعلیم سے کہاں تک فائدہ ہوا ۔ اور کہاں تک نقصان ۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ پنجاب میں ہندوستانی قومیت کے راستہ میں یہ خیال زبردست رکاوٹ ہے

چند روز ہوئے۔ میرے پاس تین چار ہندو نوجوان آئے تھے۔ میں ان کو سچے دیش بھگت اور اچھے کیریکٹر کے نوجوان سمجھتا ہوں اور مجھے ان میں سے ایک کے ساتھ خاص طور پر پیار ہے۔ انہوں نے اپنی خدمات مجھے پیش کیں اور کئی طرح کی قربانی کرنے کے وعدے کئے۔ جن وعدوں کو میں سچا اور نیک نیتی پر مبنی سمجھتا تھا اور سمجھتا ہوں۔ میرے ساتھ کئی دفعہ ان کی گفتگو اس امر پر ہوئی۔ کہ ان کو کس طرح اور کس طریقہ سے موجودہ جدو جہد میں کام کرنا چاہئے۔ ہم نے باہمی اتفاق سے ایک پروگرام بھی فیصل کیا۔ لیکن جب انہوں نے ذرا گہرے طور پر اپنی آشاؤں کا امتحان کیا۔ تو اپنے آپ کو اپنی سابقہ تنگ قومیت کی حد سے بالاتر جانے کے ناقابل پایا۔ اور مجھے کہہ بھیجا کہ ہم تو ہندو قومیت کے دلدادہ ہیں۔ اور ہم اس سے اونچا نہیں جا سکتے۔ مجھے افسوس ضرور ہوا۔ مگر میں ان کی صاف گوئی پر عاشق ہوں اور ان کا مداح ہوں۔ اس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ سچا بننا کم از کم ہندوستانی قومیت کے لئے کام کرنا کیسا مشکل ہے۔ میں اس آرٹیکل کے ذریعہ اس صوبہ کے ہموطنوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کوئی شخص اچھا ہندو۔ اچھا مسلمان یا اچھا سکھ نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ پہلے اچھا ہندوستانی نہ بنے۔ جب تک ہم تینوں مذہبی جماعتوں کو یہ تلقین دیتے رہیں گے۔ کہ ان کا پولیٹیکل اور اقتصادی نفع اس بات میں ہے۔ کہ یہ اپنے ہندوپن یا مسلمان پن یا سکھ پن پر زور دیتے رہیں تب تک ہم کو کبھی سوراجیہ حاصل نہ ہوگا۔ اور غیر قوم کی حکومت ٹل سکے گی۔ سوراجیہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہندوؤں کو ہندو قومیت کے خیال سے مسلمانوں کو مسلمانی قومیت کے خیال سے اور سکھوں کو خالصہ قومیت کے خیال سے بالاتر لے جایا جائے۔

مجھے کئی تعلیم یافتہ ہندوؤں نے کہا۔ کہ ہم مسلمانوں پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ ہمارا موجودہ اتفاق محض مصنوعی ہے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان بھی ایسا ہی خیال ہندوؤں

کی نسبت رکھتے ہیں۔ اور خالصہ نوجوانوں کو بھی یہی سبق دیا جا رہا ہے۔ میں نہایت ادب اور نہایت خلوص سے اپنے ہموطنوں سے اس خیال کو دل سے نکال دینے کی اپیل کرتا ہوں۔ خلوص سے خلوص اور محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم ایک دوسرے پر اعتبار کریں۔ ہمارا اتفاق مصنوعی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا اتفاق مصنوعی ہے۔ ہم ایک ہی مٹی سے بنے ہیں۔ ایک ہی نسل سے ہیں۔ ایک دوسرے کو اس ملک سے نکال نہیں سکتے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اتفاق سے رہیں اور اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے ملک کے انتظام کو ایسے سلسلہ میں پرو دیں کہ پھر کوئی غیر قوم ہم پر دست اندازی کرنیکا حوصلہ نہ رکھے۔ اگر ۲۲ کروڑ ہندو ۷ کروڑ مسلمانوں سے ایسے خائف ہیں کہ وہ بغیر امداد ایک تیسری قوم کے اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتے تو میری رائے میں بہتر ہو کہ ان کی ہستی ختم ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو ہندو کہنا چھوڑ دیں۔ اگر ہندو دھرم میں اسقدر زور نہیں کہ وہ اپنے بندوں کو دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ ملکر رہنا سکھا دے اور ان میں اسقدر طاقت پیدا کر دے کہ کسی دوسری مذہبی جماعت کو ان کی پولیٹیکل ہستی کو نابود کرنیکا حوصلہ نہ رہے۔ ہندو دھرم ایک ناکارہ چیز ہے اور جس قدر جلد اس کو چھوڑ دیا جائے بہتر ہے یہی خیال اسلام اور خالصہ دھرم کی بابت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگر ۷ کروڑ مسلمانوں میں اس قدر طاقت نہیں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں اور ان کی اسلامی جماعت کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستان میں ایک غیر قوم کی حکومت ضروریات سے ہے۔ تو میں کہونگا۔ کہ مسلمان اسلام پر ایک بڑا داغ لگاتے ہیں۔ اور اپنے مذہب کی توہین کرتے ہیں۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تھے۔ تو ان کی جماعت کس قدر تھی اور اگر اس وقت انہوں نے ہندوستان کی حکومت حاصل کر لی۔ تو کیا وہ اب آئندہ اپنے آپ کو برابری کی حالت میں بھی نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح سے میں خالصہ بھائیوں سے بھی یہی عرض کرونگا۔ سوراجیہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے ہندو مسلمان

خالصہ بھائی اس خیال کو اپنے دل سے دور کردیں کہ اب بھی ہندوستان میں ہندو یا مسلمان یا خالصہ راج ہونا ممکنات سے ہے۔ ہندو مسلمانوں کو نہیں نکال سکتے مسلمان ہندوؤں کو نہیں نکال سکتے۔ اور خالصہ بھائیوں کے لئے ان دونوں بڑی جماعتوں کو زیر کر لینا ناممکنات سے ہے۔ ہندو قومیت و مسلمان قومیت و خالصہ قومیت کا خیال گمراہ کرنے والا ہے۔ خدا نے ہندوستان کو دوسرے ممالک سے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے۔ اس ملک کے تمام باشندے ہندوستانی ہیں۔ جہاں اس عظیم الشان ملک میں کافی گنجائش ہے۔ کہ وہاں رہتے ہوئے مختلف مذہبی جماعتیں اپنے اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق مذہبی فرائض ادا کریں۔ بس اس میں تین یا چار قومیتوں کے نشوونما پانے کی گنجائش نہیں۔ ایک ملک میں ایک ہی قوم رہ سکتی ہے اور اگر ہم اپنے آپ کو ایک قوم نہیں بنا سکتے۔ تو ہم کو آزادی کو الوداع کہہ دینا چاہیئے۔ ہماری حکمران قوم نے ہمارے دل میں یہ خیال بٹھا دیا ہے اور وہ ہمیشہ اسی خیال کو مضبوط کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ کہ ہماری مذہبی آزادی صرف انہیں کی بدولت قائم رہ سکتی ہے۔ ان لوگوں نے آئرلینڈ والوں کے دل پر بھی یہی جادو ڈالا ہوا تھا۔ جو اب ٹوٹ گیا ہے۔ دنیا کی تمام امپیریل قومیں اسی طرح اپنا سکہ جماتی ہیں۔ اور لوگ مذہبی تعصب یا جنبہ داری میں پھنسے ہوئے اُن کی خود غرضی کو نہیں دیکھ سکتے۔

میرے وہ ہندو بھائی جو ہندو قومیت کے دلدادہ ہیں۔ اچھی طرح سے سمجھ لیں۔ کہ ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک راستہ ابدی غلامی کا ہے۔ اگر وہ اپنے مسلمان بھائیوں پر اعتبار نہ کریں گے۔ ان کے ساتھ رشتہ اتحاد پیدا نہ کریں گے۔ جو شبہات یا شکوک ان کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے ہیں ان کو دور نہ کریں گے۔ اور پورے اعتماد سے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کے موقعے نہ ڈھونڈیں گے۔ تو وہ ہمیشہ کے لئے ایک بیرونی قوم کے غلام رہیں گے۔ ان میں سے چند گورنر یا وزیر یا کونسلر یا جج یا چیف جسٹس بن جائیں۔ مگر وہ کبھی آزاد نہ ہونگے۔ میری اپنی رائے میں تو وہ امریکن لڑکا جو لوگو

سے جوتے صاف کر کے دو نین ڈالر دن میں کماتا ہے۔ مگر جب رات کو سوتا ہے تو اُس کو پریزیڈنسی کے خواب آتے ہیں۔ اور وہ یہ وشواس رکھتا ہے کہ اگر موقعہ ملے تو وہ امریکہ کے پریزیڈنٹ کی گدی پر بیٹھے گا۔ اِن ہندو گورنروں۔ وزیروں اور جسٹسوں سے لاکھ درجہ زیادہ بہتر اور سکھی ہے۔ جن کو ہر دم یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو انگریز یہ سمجھ لیں کہ وہ کافی حد تک ان کا خیر خواہ نہیں۔ میں مذہبی عقیدہ سے ہندو ہوں۔ تمام عمر مختلف طریقوں سے ہندوؤں کی خدمت کرتا رہا ہوں۔ جب لیاقت تھی میں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے حملوں سے ہندو دھرم کو ڈیفنڈ کیا ہے۔ نہ صرف ہندوؤں کو مسلمان اور عیسائی ہونے سے روکا۔ بلکہ عیسائی اور مسلمان ہوئے۔ ہندوؤں کو واپس لینے میں مدد دی۔ اچھوت جاتیوں کو ہندو حلقہ سے باہر جانے سے روکا میں نے یہ سب کچھ کیا۔ اور مجھے ذرا افسوس نہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ مگر باوجود اس کے میرا یہ وشواس اور یقین ہے کہ ہمارے لئے پولیٹیکل نجات کا راستہ ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ دل کھول کر نہایت ایمانداری سے کامل خلوص کے ساتھ۔ بلا کسی قسم کے شک کے یا شبہ کے پورے اعتماد و بھروسے سے ملجائیں۔ اگر ہندوازم میں کچھ بھی سچائی ہے۔ اور اگر ہندوؤں کی محبت یگانگت سچی ہے اور دکھاوے کی نہیں تو ممکن نہیں کہ مسلمان ان پر اعتماد نہ کریں۔ اور ان کے ساتھ نہ ملیں +

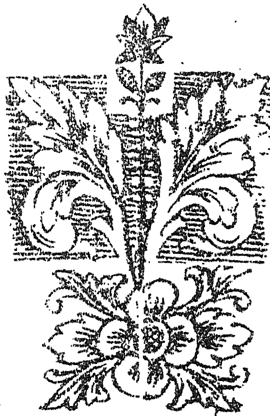
بعض ہندوؤں کا یہ خیال ہے۔ کہ ہمیشہ ہم کو ہی دبنا پڑتا ہے۔ اور اگر ہم اسی طرح دبتے چلے گئے تو آخر اس کی کیا حد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمان اور خالصہ بھائی بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہمیشہ ان کو دبنا پڑتا ہے۔ اور ہندو کسی نہ کسی چال سے ان سے بازی لے جاتے ہیں۔ میری رائے میں یہ خیالات فاسد ہیں۔ کوئی کسی سے نہیں دبتا۔ اور جو دبتا ہے آخر میں اُسی کی جیت ہوتی ہے۔ جو شخص اپنی طاقت و قابلیت کو جانتا ہوا دبتا ہے اُس کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

البتہ جو شخص اپنی کمزوری یا لاچاری یا بدعملی کی وجہ سے دبتا ہے وہ ہمیشہ مغلوب رہے گا اس کے لئے غالب آنیکا خیال ہی محض خواب ہے۔ جو شخص نہ دبنے کی طاقت رکھتا ہوا دبتا ہے۔ اس کے دبنے میں بھی شان ہے۔ جو مجبوری سے دبتا ہے۔ اس کے لئے دبنے کی شکایت کرنا لا حاصل ہے وہ تو ہمیشہ ہی دبے گا ٭

ہندو نوجوانو! میں تم پر عاشق ہوں۔ مجھے یہ فخر ہے کہ دیش بھگتی۔ حب الوطنی۔ ایثار نفسی۔ بلند حوصلگی۔ قوم پرستی۔ میں تم اپنے برادران وطن سے بڑھے ہوئے ہو۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ پچیس سال میں حکمران قوم ہمیشہ تم کو دباتی اور ذلیل کرتی رہی ہے۔ جس قدر وہ تم کو دباتے گئے اور ذلیل کرتے گئے۔ اسی قدر تمہارا حوصلہ بڑھتا گیا۔ اور تمہارے اندر سلف ریسپکٹ اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی نیک عادتیں زیادہ نشوونما پا گئیں۔ جو جماعت ایک بیرونی حکمران قوم کے سہارے بڑھنا چاہتی ہے اس کے اندر سے سیلف ریسپکٹ اور خودداری کے جذبات کمزور ہو جاتے ہیں۔ تمہارے بعض خود غرض و لالچی لیڈروں نے تم کو بھی وفاداری کے سبق سکھانے کی کوشش کی اور بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو حکمران قوم کے دسترخوان سے جوٹھے ٹکڑے کھانے کا عادی بنا دیا۔ مگر کئی بواعث سے ان کو پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ میں یہ نہیں مانتا کہ تمہارے اندر وفاداروں کی تعداد کم ہے۔ مگر میں یہ جانتا اور محسوس کرتا ہوں۔ کہ ہندوؤں کی درمیانی جماعتوں میں دیش بھگتی اور قوم پرستی کا جذبہ زیادہ پُر زور اور خالص ہے۔ تمہاری دیش بھگتی و قوم پرستی پر یہ دھبہ نہ آنا چاہئے۔ کہ تم کو اپنے برادران وطن پر بھروسہ و اعتماد نہیں ہے۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا سکھ لوگ تم کو بھڑکائیں گے مگر تم کو اشتعال میں نہ آنا چاہیئے ٭

اگر بھروسہ و اعتماد سے تم کو عارضی نقصان بھی پہنچے تو اس کی پرواہ نہ کرو۔ مجھے اُمید ہے کہ اسلامی غیرت اور خالصہ بلند حوصلگی پورے اعتماد و بھروسے سے تمہارا

ساتھ دے گی۔ اور یہ سب مذہبی جماعتیں ہندوستانی قومیت کو بنانے اور اس کو مضبوط کرنے میں شانہ بشانہ کام کریں گی۔ اور ایک شاندار آزاد ہندوستان کے نشو و نما کرنے میں پوری مدد دیں گی۔ ان تینوں جماعتوں میں بہت سے آدمی ایسے کام پر لگے رہتے ہیں کہ وہ ہندو قومیت و مسلمان قومیت و خالصہ قومیت کے نام پر وشواس و بے اعتمادی کے زہریلے بیج بوتے رہیں۔ اُن سے بچو۔ ورنہ کچھ عرصہ تو درکنار ایک صدی میں بھی سوراجیہ حاصل نہ ہوگا +



یوروپین اقوام کا پولیٹکل اخلاق

دنیا کی تاریخ اس امر کی کافی و وافی شہادت دیتی ہے۔ کہ پولیٹکل اخلاق کی کسوٹی ایک ہی رہی ہے اور اس کا نام "مصلحت" ہے۔ پرانے زمانہ کے ایشیائی فرمانروا جو پولیٹکل اخلاق کی ڈینگ نہ مارتے تھے۔ وہ علانیہ لوٹتے تھے۔ ملک گیری کرتے تھے۔ اور ملک رانی کے لئے مصلحت ملکی کا ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ اخلاق۔ انصاف اور تہذیب کا نام نہ لیتے تھے۔ زمانہ حال کی تہذیب کا یہ خاصہ ہے۔ کہ وہ جو کرتے ہیں تہذیب انصاف اور اخلاق کے نام پر کرتے تھے۔ اگر ملک گیری کرتے ہیں تو اس لئے کہ "وحشی" قوموں میں جو ہزارہا برس قبل از مسیح تہذیب یافتہ چلی آتی ہیں "تہذیب" پھیلائیں۔ اگر ملک رانی کرتی ہیں تو اس لئے کہ ان قوموں کو جو ہزارہا برس قبل از مسیح پولیٹکل ہستی رکھتی تھیں۔ قانون بناتی اور انتظام کرتی تھیں۔ اس قابل بنائیں کہ وہ اپنی حکومت آپ کر سکیں۔ یہ یوروپین قومیں اگر غیر ممالک کو ریلیں بنانے تاریں لگانے پر مجبور کرتی ہیں تو اس لئے کہ ان ریلوں و تاروں سے ان ممالک کی تجارت کو فروغ ہو اور ان کی مالی حیثیت روبہ ترقی ہو۔ غرض ان کی ملک گیری ملک رانی اور تجارت سب اخلاق کی اعلیٰ بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ دنیا میں قانون کا راج قائم کرنا چاہتی ہیں۔ ان کا قانون امیر اور غریب میں کوئی تمیز نہیں کرتا لیکن ان کی

عدالتوں میں عموماً انصاف صرف روپیہ والے کو ملتا ہے۔ وہ نسلی مساوات کے دلدادہ ہیں۔ اور رنگ و نسل کی کوئی تمیز ان کے نزدیک جائز نہیں۔ مگر صرف رنگ ہی ان کی نظروں میں پسندیدہ اور قابلِ اعتبار ہے۔

وہ دُنیا میں بزورِ شمشیر جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی جمہوریت میں مفتوحہ قوموں کی جمہور رعایا کو کوئی حق نہیں۔ ان کی جمہوریت کا اصول یہ ہے کہ فاتح قوم مفتوح قوم پر جس طرح چاہے حکومت کرے۔ وہ ایشیا میں تہذیب و جمہوریت پھیلانے کے لئے مختلف حصص ایشیا پر قبضہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدبر اور ان کے بڑے سے بڑے جمہوریت کے ممبر نیک نیتی سے یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایشیائی قومیں جمہوریت کے اصول کو نہیں سمجھتیں اور وہ صرف تلوار اور زور کی قدر کرتی ہیں۔ وہ تبت۔ ہندوستان۔ چین۔ چینی تاتار۔ آسام۔ برہما۔ ایران۔ ٹرکی اور ترکستان میں انصاف اور تہذیب کا راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ افریقہ کے وحشی باشندوں کو مہذب بنانا چاہتے ہیں۔ وہ یورپ میں بھی کم تہذیب یافتہ قوموں کو (مثلاً آئرلینڈ۔ روس۔ پولینڈ۔ ممالک بلقان وغیرہ) کو اپنے سٹینڈرڈ تہذیب پر لانا چاہتے ہیں۔ ان کے دل انسانی محبت کے جذبہ سے لبریز ہیں۔ انکی چھاتیوں سے انصاف اور انسانیت کے دودھ کی نہریں بہتی ہیں۔ ان کے دماغوں میں انصاف و عدل کے سوا اور کسی قسم کے چھوٹے جذبات کا دخل نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دُنیا پر حکومت کرنیکا بار وہ اپنے کندھوں پر لے کر باقی ساری دُنیا کو آرام کی نیند سلا دیں۔ مخلوقات اپنے اپنے مقامات پر ان کے عدل و انصاف کے بھروسہ پر آرام کی نیند سوئے۔ وہ دُنیا میں ہر قسم کی زحمت تکلیف اور مصیبت اٹھا کر اس کا انتظام کریں۔ دُنیا کے مختلف ممالک کے قوم پرستوں کو وہ ڈاکو۔ راہزن اپنے ملک کے بدخواہ۔ اپنی قوم کا دشمن۔ وحشی یا غیر مہذب کہکر پکارتے ہیں۔ انکے

اشیاء اور اُن کے خیر خواہ اُن کو جاہل - بے وقوف - بد باطن - خود غرض کا خطاب دیتے
ہیں - اور تہذیب اور اخلاق کے نام پر اُن سے اور اُن کے دیگر اہلِ مُلک سے اپیل
کرتے ہیں کہ وہ اُن اخلاق کے اصولوں کے دلدادہ خیر خواہان بنی نوع انسان کو
اپنی قوم و مُلک کو ان کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں - اور ایک مُٹھی بھر آٹے کے عوض
ان لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنی قوم و ملک کی غلامی کو دو بر پا کرنے میں اُنکی مدد
کرتے ہیں - ان کو وہ اخلاق مجسم - دانشمند سمجھدار - اپنی قوم کے بہترین خیر خواہ
بے نفس محبانِ وطن کہکر اُن کو خطابات - جاگیرات وعدے دیتے ہیں - اور ہر طرح
سے ان کے گیت گاتے ہیں - ان کے نزدیک ہر ایک ملک کا بہترین نفع اسی میں
ہے - کہ اُن کے زیر حکومت آجائے اور ہر ایک مُلک کے قوم پرستوں اور دانش
مندوں کا فرض ہے - کہ ان کے جھنڈے کے نیچے آکر ان کو تمام دُنیا کی دولت
اکٹھا کرنے میں مدد دیں - اُن کے نزدیک بہادر وہ ہے جو ان کے جھنڈے تلے
آکر دوسرے ممالک کو فتح کرنے میں اُن کی مدد کرے - اُن کے نزدیک شجاعت
اسی کا نام ہے - کہ انسان تازہ سے تازہ طاقتور ہتھیاروں کے ذریعہ نہتی قوموں
کو زیر کرے اور نہتے انسانوں کو اپنی گستاخی کا سبق سکھائے - ان کے نزدیک
"ناشٹ ہوٹو" ایسے ہی لوگوں کا حق ہے -

یورپ کا یہ اخلاقی کوڑھ صرف ایشیائی لوگوں پر ہی حاوی نہیں - اِس میں وہ
تمام قومیں اور انسان شامل ہیں جو کسی طرح سے بھی ان کے امپیریلزم کے مخالف
ہوں - چار سال ہوئے - روس پر بولشویکوں نے قبضہ کر لیا - یہ بولشویک اسی
ملک کے باشندے ہیں اور ان کے اصول کتنے ہی غلط ہوں مگر اُن کی زندگی سادہ
اور شخصی خود غرضی و عیاشی کے جرائم سے بری ہے - تاہم تمام یورپ اور امریکہ انکو
ڈاکو - بے ایمان - بنی نوع انسان کا دشمن کہہ کر پکار رہا - اور اُن پر طرح طرح کے

جھوٹے اور بے بنیاد الزام لگاتا رہا۔ انگریزی اخبار لوگوں کو ان سے متنفر کرتے رہے اور یہ شیخی مارتے رہے۔ کہ ان لوگوں سے صلح کی گفتگو کرنا ان کے اخلاقی کوڈ کے احکام کے سخت منافی تھا لیکن جس وقت برطانیہ کلاں کو دنیا میں بذریعہ تجارت تہذیب پھیلانے کی ضرورت اشد معلوم ہوئی۔ اور جب برطانیہ کلاں اپنی تمام جنگی طاقت اور اپنی تمام ڈپلومیسی سے ان کو زیر کرنے میں ناکامیاب رہا۔ تو برطانیہ کلاں کے تمام تہذیب یافتہ اور شائستہ اخلاق مجسم مدبروں نے ان سے صلح کرلی ۔

اسی طرح برطانیہ سالہا سال سے آئرلینڈ کے قوم پرستوں کو ڈاکو۔ قاتل۔ خونی۔ بدمعاش وغیرہ کہتا رہا۔ طرفین نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی ایک دوسرے کے مار ڈالے اور نہایت بے رحمی سے ایک دوسرے کے ساتھ سلوک کیا۔ اس جنگ میں بوڑھا۔ بچہ۔ بیوہ اور یتیم کوئی بھی محفوظ نہ رہا۔ [illegible] کر دیا گیا گھروں کو جلا دیا گیا۔ سوتے ہوئے آدمیوں کو پکڑ کر مارا گیا۔ راستوں میں راہگیروں اور مسافروں کو بندوق کا نشانہ بنایا گیا۔ ریلیں توڑ دی گئیں۔ غرض کوئی کام نہیں ہے۔ جو ان تہذیب کے پھیلانے والوں نے نہیں کیا۔ آئرلینڈ کے قوم پرستوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ حتیٰ کہ دنیا اس پولیٹکل اخلاق کی نمائش سے تنگ آگئی۔ اب انگریزی قوم کے انصاف کی شکل بدل گئی۔ ان آئرش قوم پرستوں کے سردار مسٹر ڈی ویلرا صاحب کو صلح کی گفتگو کے لئے بلایا گیا اور لندن میں انکی وہ عزت کی گئی جو آزاد قوموں کے حکمرانوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ مگر دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان میں بھی اس اخلاق کا نمونہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ "پنجاب کا سب سے بڑا باغی" قوم پرست آج پنجاب گورنمنٹ کا وزیر اور پرنس آف ویلز کی استقبالیہ کمیٹی کا رکن اعظم ہے۔ بنگال کا سب سے

بڑا سرکاری مجرم اور باغیوں اور بلوہ گروں کا سردار آج گورنمنٹ بنگال کا معتمد ہے۔ یو۔پی کے وہ سب سے بڑے مجرم جن کے برخلاف زور شور سے آرٹیکل لکھے جاتے تھے یو۔پی گورنمنٹ کے سب سے قابل اعتماد عہدہ دار ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی پنڈت جگت نرائن پر اظہار ناراضگی ہو رہا تھا۔ اور اُن پر طرح طرح کے الزام لگائے جاتے تھے لیکن آج اُن کی تعریف کے راگ گائے جا رہے ہیں ۔

اس تصویر کی دوسری طرف بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ وہ ہندوستانی جو سال گزشتہ تک نوکر شاہی میں کسی قسم کا کوئی وصف نہیں دیکھ سکتے تھے اور جو گورنمنٹ کے خلاف اپنی زبان و قلم کی توپیں چلاتے تھے۔ اور پولیٹکل پلیٹ فارم پر اور [illegible] خیالات کو دھواں دھار کر دیتے تھے۔ آج نہ صرف اُس نوکر شاہی کے وفادار [illegible] ہیں۔ بلکہ اس کے مداح بنے ہوئے ہیں۔ آج نوکر شاہی کا نام [illegible] ہوا [illegible] ہے۔ آج وہ اُن معاصرین کو پھانسیاں دلوانے [illegible] سے ذلیل کروانے کی فکر میں ہیں۔ جو ابھی دو سال ہوئے انکے واسطے قابل عزت تھے اور جنکی ذات اور حیثیت اور ایثار نفسی میں وہ کالموں کے کالم سیاہ کرتے تھے ۔

مغربی تہذیب! تیرے شعبدے انسانی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اے یوروپین اخلاق! تیرے کرشمے ہماری سمجھ بوجھ سے اُونچے ہیں۔ یہ تجھ میں ہی طاقت ہے کہ تو دن کو رات اور رات کو دن کرکے دکھا دے۔ یہ تیرے ہی میں گُن ہیں کہ تو اخلاق کی تصویر کو جس طرح چاہے بدل دے۔ اخلاق کو بداخلاقی اور بداخلاقی کو اخلاق بنا دے۔ ہم تیری طاقت کے قائل ہیں گو تیری سچائی کے ابھی تک قائل نہیں ہوئے۔ اگر تیرے اخلاق پر یہ طاقت ہے کہ ہم کو کبھی کبھی اپنی سمجھ پر بھی شُبہ ہو جاتا ہے۔ یہ ناممکن نہیں کہ تیرا یہ جادو [illegible] جو آج تیری سچائی کے قائل نہیں۔ اے یوروپین اخلاق تو [illegible] ہے۔ سچ سچ آج کل تو ہی تو ہے۔ باقی سب مایا ہی ہے ۔

کیا قومی انسٹی ٹیوشنوں میں تنخواہیں

سارے سٹاف کو برابر ملنی چاہئیں؟

ایک قومی انسٹی ٹیوشن کے ویونگ ماسٹر یعنی کھڈی استاد نے مجھے ایک طویل چٹھی لکھی ہے جس میں اس امر پر اعتراض کیا ہے۔ کہ جس انسٹی ٹیوشن میں وہ کام کرتا ہے۔ اس کے افسر اعلیٰ کو جو ایک انگریزی یونیورسٹی کا ایم۔ اے ہے۔ اور انگریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ کیوں دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیجاتی ہے۔ حالانکہ اس کو بہت تھوڑی تنخواہ ملتی ہے۔ اس نے یہ بھی اعتراض کیا ہے۔ کہ حالانکہ ہم انگریزی بالائی کی تعلیم کے خلاف اسپیچ دیتے ہیں۔ تاہم انگریزی جاننے والوں کو زیادہ تنخواہیں دیتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں۔ ان الزامات میں بہت کچھ صداقت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے موجودہ سوشیل نظام میں جو معاوضہ کام کرنے والوں کیلئے ہے وہ بالکل کسی اصول پر مبنی نہیں ہے۔ موجودہ پولیٹکل و اقتصادی حالات نے بعض خاص قسم کی لیاقتوں کی بازاری قیمت مصنوعی طور پر بڑھائی ہوئی ہے۔ سوشیل یا سماجک انصاف اس امر کا مقتضی تھا کہ ہر ایک شخص کو یا تو اس کی حسب ضرورت معاوضہ یا مول اس اصول پر ملتا کہ اس کا کام سوسائٹی کے لئے کس درجہ تک مفید ہے

یہ دونوں اصول جو سوشلسٹ فلاسفی نے بیان کئے ہیں۔ اور اس وقت ان کا استعمال سوویٹ روس میں ہو رہا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہاں تک اس تحریک میں اہل روس کو کامیابی ہوگی ۔

موجودہ سوشل انتظام اقتصادیات کے اصول پر نہیں چلتا ہے۔ اس نظام میں قیمت کو ادنیٰ سے ادنیٰ لوگوں کو بلا لحاظ لیاقت کے اور بلا لحاظ اس امر کے ان کی ذات کس حد تک سوسائٹی کے واسطے مفید ہے بہت کچھ طاقت حاصل ہو گئی ہے طاقت و اختیار زیادہ تر ان کے ہاتھوں میں اکٹھا ہو گیا ہے۔ وہی بازاری قیمت کو مقرر کرتے ہیں اور وہی اس کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس لئے جو طاقتور دولتمند ہوں ان کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ ان کی قیمت زیادہ ہے۔ اسی اصول پر ان کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔ ایک [illegible] ہماری گورنمنٹ پچاس ساٹھ ہزار روپیہ سالانہ تک پیدا کر سکتا ہے حالانکہ اسی لیاقت کا آدمی کسی دوسرے ملک میں اس سے دسواں بیسواں یا پچاسواں حصہ بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ پولیٹکل طاقت دولتمندوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے قانون ایسے بنائے ہیں کہ جن سے دولتمندوں کی حفاظت اور ان کے آرام کی بہت زیادہ پرواہ کی گئی ہے۔ تمام سوسائٹی ایک قسم کے فرضی اصول پر قائم ہے اس لئے سب ہی خدمات کی قیمت فرضی مقرر ہوتی ہے۔ سوسائٹی کے واسطے سب سے مفید اور ضروری خدمات کے انجام دینے والے وہ لوگ ہیں جو کھانے کے لئے اناج۔ پہننے کے لئے کپڑا و جوتا اور رہنے کے لئے مکان بناتے ہیں۔ مگر سوسائٹی نے ان تینوں خدمات کو بہت حقیر قرار دے رکھا ہے ۔

بعض لوگ شاید یہ کہیں گے کہ دماغی و روحانی خدمات کی قدر مادی خدمات سے بہت زیادہ ہے لیکن دیکھتے ہیں کہ اکثر قابل سے قابل مصنف و اہل علم اور بعض نہایت لائق سے لائق استاد و افلاس کے مرتے ہیں مستثنیات سے کوئی

وعدہ قائم نہیں ہو سکتا قیمت اس خدمت کی زیادہ ملتی ہے جو موجودہ Capitalist
سوسائٹی کو زیادہ مفید معلوم ہوتی ہے۔ ایسی سوسائٹی میں کیا ہم قوم پرست اپنے
قومی انسٹی ٹیوشنوں میں مختلف اصولوں پر عمل کر سکتے ہیں؟ جواب نفی میں دینا پڑیگا
اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو سارے قوم پرست سوشل معاملات میں مساوات کے
قائل نہیں اور وہ موجودہ نظام میں اس قسم کا انقلاب پیدا کرنے کے حق میں نہیں۔
دوئم عوام الناس ہیں۔ ان اصولوں کا پرچار نہیں ہوا جب تک سوسائٹی کی اکثریت
ان خیالات کی نہ ہو جائے تب تک ان خیالات کو عمل میں لانا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن
ہے۔ قومی مجالس جو روپیہ قوم سے جمع کرتی ہیں۔ اس کو وہ چند ممبروں کے خیالات
کے مطابق خرچ نہیں کر سکتیں ۔

تاہم میں اپنے عزیز کھنڈی ماسٹر کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ پیشے میں وہ
لیاقت پیدا کر لیں جو اپنے کام میں ان کے کالج کے پرنسپل نے حاصل کی ہے
تو ان کے لئے تنخواہ غالباً چار سو روپیہ ماہوار بھی تھوڑی ہوگی۔ پیشہ ور لوگ
اگر آپس میں اتفاق کر لیں تو وہ اپنی تنخواہ جس قدر چاہیں بڑھا سکتے ہیں میں کل
جالندھر میں ایک نہایت ہی دولتمند بنئے کی دوکان پر چندہ مانگنے کے لئے گیا میں
وہاں پورا ایک گھنٹہ بیٹھا رہا۔ آخر اس نے بہت سے صلاح مشورہ اور بحث
کے بعد قریباً عہ (۲۵) پیش کئے۔ اس کی رائے میں بیوپاریوں کی آمدنی میں
تو بیحد اضافہ ہونا چاہیئے۔ مگر ان سے جو مطالبات سوسائٹی کرتی ہے۔ اس میں بیشی
ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ مثلاً اس کو اس میں تو اعتراض نہیں کہ اناج یا روٹی کی قیمت
میں بیشی ہو جائے۔ بشرطیکہ اس کو سستی خرید کر گراں فروخت کرنے کی اجازت ہو۔ مگر
ان کو اس میں سخت اعتراض ہے کہ مزدوروں کی مزدوری میں۔ نوکروں کی نوکری میں
ریل کے کرایہ میں۔ بابوؤں کے ناجائز مطالبات میں یا ان کے ٹیکس میں بیشی ہو۔

سوسائٹی کے لیڈروں کی ایک یہ شہادت ہے کہ اس میں اس قسم کے بے محنت دولت کمانے والوں کو اس قدر فوقیت عزت اور توقیر حاصل ہے۔ سپاہی جو اس کی حفاظت کے لیے لڑتا ہے یا پہرہ دیتا ہے اس کو صرف چند روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ نوکر جو اس کو روٹی پکا کر دیتا ہے اس کو دس پندرہ روپیہ ماہوار ملتے ہیں۔ غرضیکہ تمام دنیا مختلف صورتوں میں اس کی خدمت کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے اندازہ روپیہ جمع کر سکتا ناواجب طور پر سب سے زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے ۔

دنیا میں وہ خدمتیں وہ زیادہ پاک اور متبرک ہیں جن سے بنی نوع انسان کا فائدہ ہو جن خدمتوں میں انسانوں کو قتل۔ خاندانوں کو تباہ۔ ملکوں و قوموں کو تباہ اور زیر و زبر کرنا پڑتا ہے۔ وہ خدمتیں مقابلتاً ناپاک اور نامتبرک ہیں۔ جو خدمتیں جسمانی طاقت پر منحصر ہیں وہ اسی حد تک پاک ہیں جس حد تک وہ آزادی کے راستہ میں یا کمزوروں کے ڈیفنس میں یا حفاظت خود اختیاری میں کی جائیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایک زمانہ تھا کہ تمام طاقت فوجی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ آجکل کی تہذیب کو اس بات کی شیخی ہے کہ اس نے فوجی طاقت کو سول طاقت کے ماتحت کر دیا ہے۔ لیکن محض شیخی ہی شیخی ہے۔ اصلیت اس میں صرف اس قدر ہے کہ زمانہ حال میں فوجی طاقت روپیہ کی طاقت کے ماتحت ہے۔ ماڈرن تہذیب روپیہ کی تہذیب ہے۔ اس میں زر کی پوجا کی جاتی ہے۔ اور اس واسطے طاقت کا مرکز ساہوکار اور سرمایہ دار ہیں۔ ساہوکار اور سرمایہ دار جس قدر چاہیں مضبوط آدمی اپنی ملازمت میں نوکر رکھ سکتے ہیں۔ دولتمند اور سرمایہ دار اقوام دنیا بھر کے جنگجو اور طاقتور انسانوں کو اپنی ملازمت میں بھرتی کر کے ان سے کام لے سکتی ہیں۔ اس وقت دنیا میں راج ان لوگوں کا ہے جن کو ہمارے بعض بھائی حقارت سے بنیا کہتے ہیں۔ ہندوستان کی تجارت پیشہ اقوام سے علیحدہ رکھنے کے لئے انگریز بنئے

کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اِن بنیوں کو ایسا سستا نہیں خرید سکتے جیسا کہ وہ جنگجو اقوام کو۔ ورنہ اُن کے سوشیل نظام میں اس وقت جو قدر و منزلت بنئے کی ہے۔ وہ کسی جرنیل کی نہیں۔ انگریزی بنکوں کے منتظمان کو اور انگریزی کارخانہ کے مہتمان کو فوجی افسران سے بھی زیادہ تنخواہیں ملتی ہیں +

ہمارے بعض مسلمان و سکھ بھائی یہ فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے برٹش ایمپائر کو وسیع بنایا ہے۔ انگریزوں کی لڑائیوں کے لڑے ہیں۔ دوسری قوموں کو انگریزی اطاعت کے ماتحت لائے ہیں بیش بہا خدمات کی ہیں اِن خدمات کی بنیاد پر وہ صرف جاگیریں پنشنیں۔ انعامات و اکرامات مانگتے ہیں بلکہ اسامیاں۔ عہدے اور کونسلوں کی ممبریاں بھی مانگتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنی جسمانی طاقت کو ایسا سستا بیچا کہ اس کی قیمت وصول کرنے کے لئے وہ طرح طرح کے مطالبات کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کو اس امر کا فخر نہیں کہ انہوں نے دنیا کے بھلے کا کوئی کام کیا۔ اُن کو اس امر کا فخر نہیں کہ انہوں نے دنیا میں اپنا پاکیزہ مذہب پھیلایا۔ اُن کو اس امر کا فخر نہیں کہ انہوں نے دماغی دنیا میں کوئی قابل قدر ترقی کی۔ ان کو صرف اسی امر کا فخر ہے کہ انہوں نے سرکار انگریزی کو اس ملک میں تسلط جمانے میں مدد دی۔ سرکار انگریزی کے ہندوستانیوں نے غیر ہندوستانی دشمنوں کو نیچا دکھایا۔ سرکار انگریزی کی سلطنت کو پھیلایا۔ دوسری قوموں کو غلام بنایا +

ہم کو سوراجیہ کب ملیگا؟

مہاتما گاندھی کے ساتھ دورہ کرتے ہوئے جو کچھ میں نے دہلی۔ بھیوانی روہتک۔ گوجرانوالہ و راولپنڈی میں دیکھا۔ اس سے میرا یقین پختہ ہو گیا کہ ہم کو ایک سال میں سوراجیہ مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم (۱) باامن نان کو اپریشن کریں۔ (۲) اپنے اندر ڈسپلن پیدا کریں۔ بھیوانی۔ گوجرانوالہ اور راولپنڈی میں میں مہاتما جی کے ساتھ مستورات کے جلسوں میں شامل تھا۔ اور جو نظارہ میں نے ان مستورات کے جلسوں میں دیکھا وہ مجھے تمام عمر نہ بھولے گا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ عورتوں میں جوش کافی ہے۔ اور لوگ (مرد عورت) سب سوراجیہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ وہ سب کے سب موجودہ طریقہ گورنمنٹ سے بہت ناراض ہیں۔ اور سوراجیہ حاصل کرنے کے لئے بہت بے قرار ہیں۔ ان کے دل اُمید کی امنگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ مہاتما گاندھی کو اپنی ان امیدوں کا مرکز سمجھتے ہیں۔ اور اسی واسطے انکی پوجا کرتے ہیں۔ پچھلے آٹھ سات ہفتوں میں مجھے لاہور کے طالبعلموں سے بھی ملنے کے موقعے ملے۔ اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ پنجاب کے طالبعلموں کے دل قوم پرستی کے ولولوں سے لبریز ہیں۔ مگر ان کے ماتا پتا ان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ اور ان میں اتنی ہمت نہیں۔ کہ جو غلامی کی زنجیریں

رواج نے۔ عادت نے اور ضرورت نے ان کے پیروں میں ڈالدی ہیں انکو توڑ کر آزاد ہو جائیں۔ میں ان کو الزام نہیں دے سکتا جب میں دیکھتا ہوں۔ کہ پنجاب کی تعلیم یافتہ پارٹی کے لیڈر جو تمام عمر آزادی۔ آزادی پکارتے رہے اور اسی کی تعلیم دیتے رہے۔ اس وقت اپنی آتما میں اس قدر طاقت نہیں پاتے۔ کہ وہ آزادی کی اس جنگ میں قوم کا ساتھ دیں تاہم تعلیم یافتہ پارٹی کا درمیانی درجے کا طبقہ و عوام الناس پورے دل سے جوش و خروش سے مہاتما گاندھی کے مت کے ماننے والے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہیں۔ اور میرا یقین ہے کہ جس وقت وہ وقت آئیگا جب مہاتما جی ان کو آگے قدم رکھنے کی ہدایت کریں گے۔ تو وہ ضرور ان کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ اس بات سے انکار کرنا لاحاصل ہے۔ کہ مہاتما جی ایک باامن انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں تو انقلاب پیدا ہو چکا۔ ان کی زبان سے اسی انقلاب کی صدا آتی ہے۔ تیسرا قدم ان کے افعال کا ہے۔ یہ ضروری ہے۔ کہ لوگوں میں ضبط کرنے اور غصہ سے بچ کر شانتی سے تکلیف و مصیبت برداشت کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ بعض لوگ اس کو ناممکن سمجھتے ہیں لیکن میں اس کو ناممکن نہیں سمجھتا۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ ملک میں امن رکھا جائے امن میں کسی طرح کا خلل نہ آنے دیا جائے۔ اور ہر قسم کی دست درازی کو روکا جائے

کسی چیز کو حاصل کرنے کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ اول من میں اسکی خواہش کا ایسی زبردست صورت اختیار کرنا کہ انسان ہر وقت اسی کا بیان کرتا ہے۔ اور اسکے نہ ملنے سے اپنے آپ میں بیزار ہو۔ دوم من کی خواہشوں کا بانی میں آنا جس وقت زبان بے خوف ہو کر اپنی خواہشوں کے اظہار میں صرف ہوتی ہے تو یہ دوسرا زبردست قدم اس کے حاصل کرنیکا ہوتا ہے

تیسری منزل وہ ہے کہ جب انسان اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے کرم کرنے لگے میرا خیال ہے کہ ہم دو منزلوں میں سے گذر چکے ہیں اس وقت ہم تیسری منزل میں داخل ہونے والے ہیں یا ہو رہے ہیں تعلیم یافتہ جماعت کے لیڈروں کی دو دلی ہماری ترقی کی رفتار میں حائل ہے۔ مگر یہ بات کوئی ہم ہی پر مخصوص نہیں ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے تعلیم یافتہ جماعت کے اول میں طبقہ نے اپنے تمام انٹرسٹ حکمران قوم کے ساتھ وابستہ کر لئے ہیں۔ اور وہ اس وقت اپنے انٹرسٹ کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ دل سے وہ بھی آزادی کے حق میں ہیں لیکن انکے اقتصادی انٹرسٹ اُن کو حکمران جماعت کا ساتھ دینے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ میں اُن سے مایوس نہیں ہوں۔ اور بھروسہ رکھتا ہوں کہ جب دیش کے لئے قربانی کی سپرٹ اُن کے اندر پرورش کرے گی۔ تو وہ ضرور قوم کا ساتھ دیں گے۔ اور ملک کے عوام الناس اُن کو ایسا کرنے پر مجبور کریں گے۔ عوام الناس کا جوش۔ ان کی شردھا اور ان کے اندر جو اس وقت قربانی کی سپرٹ موجود ہے۔ یہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ اور مجھے یقین پڑتا ہے کہ اگر تعلیم یافتہ اپنی زندگی کی پوترتا و بے غرضانہ سپرٹ سے اُن کو یقین دلا دیں کہ وہ پیچھے نہ ہٹیں گے تو عوام ان کی پیروی کریں گے اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے لئے تیار ہونگے ۔

سوراجیہ حاصل کرنے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کی پبلک لائف کو پوتر (پاکیزہ) اور بے غرضانہ بنایا جائے اور اس میں سادگی اور قربانی کی سپرٹ پیدا کی جائے جس روز ہم کو یہ درجہ حاصل ہو گیا اسی روز ہم کو سوراجیہ حاصل ہو جائے گا ۔

ہندو مسلم اتحاد ہو جیسی کہ چاہیئے

جب میں نے پچھلے شملہ میں لیکچر دیا تھا۔ اس وقت تک کانگریس نے نان کو اپریشن یعنی عدم تعاون کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد دو کانگریسیں ہوئیں اور دونوں نے عدم تعاون کو منظور کیا۔ متواتر چھ مہینے سے ہندوستانی پریس اور پلیٹ فارم پر مسئلہ عدم تعاون پر بحث ہو رہی ہے۔ گو بہت کچھ اس کے حق میں اور اس کے برخلاف لکھا جا چکا ہے۔ تاہم عدم تعاون کے متعلق ابھی غلط خیال ہیں جن کو صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ عدم تعاون کے مخالف متواتر غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔

سب سے اول بات جو عدم تعاون کی نسبت کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ترک موالات پھیلنے کا راستہ خیالی وہم ہے۔ کوئی آدمی گورنمنٹ وقت کے ساتھ خواہ وہ گورنمنٹ قومی ہو یا غیر قومی بالکل قطع تعلق نہیں کر سکتا۔ خصوصاً اس گورنمنٹ سے جس نے اپنا جال کو ایسا وسیع پھیلایا ہے کہ زندگی کی کوئی شاخ بھی اس کی نگرانی سے خالی نہیں۔ مثلاً شملہ میں دیکھئے یہاں پر پانی۔ آگ۔ روشنی۔ جو زندگی کی ابتدائی ضروریات ہیں۔ یہ بھی سب گورنمنٹ کی زیر نگرانی ہیں۔ یہاں کی میونسپلٹی کا بھی ایک سرکاری جماعت ہے۔ اور شملہ کا بہت بڑا حصہ اس کی ملکیت ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی [illegible] یہ بحث کرے کہ عدم تعاون کے ماننے والوں کو شملہ میں رہنا ہی

نہیں چاہئے۔ تو یہ بحث بالکل لچر اور بیہودہ ہوگی۔ اِسی واسطے کانگریس نے ان باتوں کو صاف طور پر بیان کر دیا جن میں وہ ترک موالات کی سفارش کرتے ہیں اس رزولیوشن کے باہر جو تعلقات گورنمنٹ کے ساتھ ہیں۔ ان میں تا بحال اُنہوں نے ترک موالات کو ملتوی رکھا ہے۔ مثلاً ابھی تک اُنہوں نے یہ سفارش نہیں کی۔ کہ ہر محکمہ کے سرکاری ملازم ملازمت چھوڑ دیں۔ اس لئے کانگریس نے ترک موالات کے لئے وہ محکمے چھانٹے ہیں جن میں گورنمنٹ کی طاقت اور اُس کی ہر دلعزیزی کا دارومدار ہے۔ ترک موالات کا اصول یہ ہے۔ کہ جس گورنمنٹ سے ہم ناراض ہیں اور جو اپنی رعایا کی پرواہ نہیں کرتی اور جو بقول مہاتما گاندھی کے شیطانیت کرتی ہے اُس کو ہم کوئی ایسی مدد نہ دیں جس سے وہ گورنمنٹ زیادہ مضبوط ہو جائے۔ ترک موالات کی کامیابی کا دارومدار ہمارے اپنے اخلاقی بل پر ہے۔ اور اِس لئے انڈین نیشنل کانگرس قوم سے اپنے اندر اخلاقی طاقت پیدا کرنے کے لئے اپیل کرتی ہے اور ہم کو ہدایت کرتی ہے۔ کہ زندگی کے بعض بڑے رکنوں میں ہم گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں۔ اور جن باتوں سے کہ ہماری قومیت کمزور ہوتی ہے ان کو ترک کر دیں۔ مثلاً اس گورنمنٹ کا بڑا زور تعلیم یافتہ جماعت پر ہے۔ جو اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو چھوڑ کر انگریزی قوم کی مددگار اور انگریزی تعلیم کی دلدادہ ہوگئی ہے۔ دوسری بڑی بھاری اخلاقی امداد اِس گورنمنٹ کو عدالتوں کے ذریعہ سے ملتی ہے ہمارا چھوٹے سے چھوٹا مقدمہ اور بڑے سے بڑا مقدمہ ان عدالتوں میں جاتا ہے۔ اور ہم کو آپس میں ایک دوسرے پر ایسی بے اعتباری ہوگئی ہے۔ کہ ہم کسی ہندوستانی کو اِس قدر قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے۔ کہ اِس سے بلا رو و رعایت انصاف کی امید کر سکیں۔ جب کبھی ہندو مسلمانوں میں کوئی تنازعہ ہوتا ہے تو ہم انگریزوں سے انصاف کرانے کے خواستگار ہوتے ہیں۔ اور انگریز ہماری اِس کمزوری کا فائدہ

اُٹھا کر ہم کو یہ محسوس کراتے ہیں۔ کہ گویا انگریزی گورنمنٹ کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ ہماری قومی آزادی کے دشمن یا مخالف ہم کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ جب ہندو مسلمانوں کو ایکدوسرے پر اعتبار نہیں اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے گلوگیر رہتے ہیں۔ تو اس ملک میں سوراجیہ کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ اس واسطے ترکِ موالات کی سب سے ضروری مدیہ ہے۔ کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان اتفاق کو بڑھایا جائے۔ ان کو ایک دوسرے پر اعتبار کرنا اور بھروسہ کرنا سکھایا جائے۔ سوراجیہ حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے ÷

ہندو مسلمانوں کے درمیان ترکِ موالات کے سبب سے اور خلافت اور پنجاب کے معاملات کی وجہ سے جو اتفاق قائم ہو گیا ہے۔ اس سے انگریزوں پر بہت فکر ہو رہا ہے۔ میں اپنے ہندو مسلمان بھائیوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ ترکِ موالات کی کامیابی کی کنجی اور سوراجیہ کی کنجی ہندو مسلم اتحاد ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ موجودہ زمانہ کو غنیمت سمجھ کر اس اتفاق کو مستقل بنائیں۔ ہندوؤں کو سمجھنا چاہیئے کہ اس ملک میں سوراجیہ قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ سوراجیہ کے حاصل کرنے میں اور اس کو بعد میں قائم رکھنے میں مسلمان اُن کے ساتھ شامل نہ ہوں مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اسلام یورپین قوموں کے ہاتھ سے اپنی عزت کو محفوظ نہیں رکھ سکتا جب تک کہ ۲۲ کروڑ ہندو مسلمانوں کو اسلام کی آزادی کے حاصل کرانے اور قائم رکھنے میں مددگار نہ ہوں۔ ابھی چند مہینے ہوئے کہ ہم کو ہندوستان کے بڑے بڑے حکام اور ہندوستان کے بڑے بڑے اینگلو انڈین اخبار۔ بلکہ ہمارے اپنے ہی ماڈریٹ بھائی یہ طعن دیتے تھے۔ کہ صلح نامہ ترکی ایک امر فیصلہ شدہ ہے اور اس کی تبدیلی کے لئے کوشش کرنا رائیگان ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے اتفاق کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ آج انگلستان اور فرانس دونوں کے دونوں عہدنامہ

ٹرکی میں قابل قدر تبدیلیاں کرنے کے لئے خود آمادہ ہیں۔ بعض ہندو بھائی یہ خوف کرتے ہیں۔ کہ اگر عہدنامہ ٹرکی مسلمانوں کے حسب اطمینان تبدیل ہوگیا۔ تو وہ ہندوؤں کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور پھر انگریزوں سے مل جائیں گے۔ مجھ کو اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ کیونکہ میں مسلمانوں کو ایسا بیوقوف نہیں سمجھتا۔ آج جو طاقت انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ اتحاد سے پیدا کی ہے۔ اگر وہ ان کو زائل کردیں گے تو جو فائدے اُن کو صلحنامہ کی ترمیم سے اب پہنچنے والے ہیں اُن کا پھر ہاتھ سے چلا جانا ممکنات سے نہ ہوگا۔ میں یہ نہیں خیال کرتا کہ عہدنامہ ٹرکی میں جو تبدیلیاں ہونے والی ہیں وہ صرف ترکِ موالات کی تحریک کا نتیجہ ہیں۔ مگر میں یہ ضرور یقین کرتا ہوں کہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد اور ترکِ موالات نے بہت حد تک انگلستان کو اس عہدنامہ کی ترمیم پر رضامند ہونے کے لئے قائل کیا ہے۔

اینگلو انڈین اخبارات اور اینگلو انڈین حکام ہر روز کانگرس کی پارٹی پر مخول اڑاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ترکِ موالات کامیاب نہیں ہوا۔ ان کی بحث یہ ہے کہ ترکِ موالات کے سلسلے میں بہت تھوڑے وکیلوں نے وکالت چھوڑی بہت تھوڑے خطاب یافتہ لوگوں نے اپنے خطاب ترک کئے اور بہت تھوڑے طالبعلموں نے سکولوں اور کالجوں کو چھوڑا۔ مگر ترکِ موالات کی کامیابی یا ناکامیابی کو اس معیار سے جانچنا نہ صرف غلطی ہے بلکہ بے وقوفی ہے ٭

ترکِ موالات ایک سپرٹ ہے۔ اس تحریک کی باقی تمام شاخیں اس سپرٹ کو ظاہر کرنے اور منتقل کرنے کے ذریعے ہیں۔ ترکِ موالات کی کامیابی ان عظیم الشان جلسوں سے لگانی چاہئے۔ جو ہندوستان کے ہر ایک حصہ میں مہاتما گاندھی اور دیگر لیڈران کانگرس کی تقریریں سننے اور اُن کی عزت کرنے کے لئے ہوتے رہے ہیں۔ اگر ترکِ موالات ناکام ہو چکا ہے تو کیوں یہ [illegible]

اینگلو انڈین حکام اپنے خیالات کے پرچار میں اتنے بڑے بڑے جلسے نہیں کر سکتے آج ماڈریٹ لیڈر اپنے دفتروں میں بیٹھ کر یا انگریزوں کو ڈائننگ روم میں گرم گرم چائے پیتے وقت مہاتما گاندھی کے نان کواپریشن کا مخول اڑا سکتے ہیں لیکن ان کو یہ جرأت نہیں کہ ملک کے کسی حصہ کی ہمدردی اپنی طرف کھینچ سکیں۔ کیا کسی شخص کو اس بات سے انکار ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کے عوام اور ہندوستان کے نوجوان قریباً سب مہاتما گاندھی کے ساتھی ہیں۔ ماڈریٹ پارٹی میں صرف وہ چند بزرگ ہیں۔ جن کی عمریں ان نعمتوں کے انتظار میں خرچ ہوئیں۔ جو آج انکو ریفارم سکیم کے طفیل حاصل ہو گئیں۔ اور ترک موالات کی کامیابی کی دوسری دلیل یہ ہے۔ کہ گورنمنٹ کے چھکے چھوٹے ہوئے ہیں اور وہ اپنا تمام زور اس تحریک کو ملیامیٹ کرنے میں خرچ کر رہی ہے۔ اگر یہ تحریک ناکامیاب ہو چکی ہوتی۔ تو گورنمنٹ کو اپنی جدید تشدد کی پالیسی جاری کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایک مکھی کو مارنے کے لئے اس قدر طاقت خرچ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی لیکن آج ہندوستان کی تمام گورنمنٹیں مع اپنے مددگاروں کے جن میں بدقسمتی سے ہندوستانی تعلیم یافتہ جماعت کے بہت سے لیڈر شامل ہیں۔ اپنا پورا زور مہاتما گاندھی کی تحریک کو کچلنے میں لگا رہے ہیں۔ بالکل تھوڑے عرصہ میں بیسوں آدمیوں کی زبان بندیاں ہوئیں اور بیسیوں کے برخلاف احکامات زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری جاری کئے گئے۔ جن کو ترک موالات کے معتقدوں نے نہایت صبر سے برداشت کیا۔ ترک موالات کی کامیابی کی یہ دلیل ہے۔ کہ ہم نے بغیر کسی قسم کے امن میں خلل ڈالنے کے گورنمنٹ کو اس قسم کے تشدد کے لئے مجبور کر دیا۔ یہ تشدد سب سے بڑا ثبوت عدم تعاون کی کامیابی کا ہے۔ ہمارے ماڈریٹ بھائی جو اس وقت ہر ایک صوبے میں گورنمنٹ کے دائیں بازو بنے ہوئے ہیں اور سلطنت

کے انتظام میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ بھی پورے طور پر اس تشدد کے ذمہ دار ہیں۔ تشدد کی پالیسی اس صوبے میں سب سے زیادہ زوروں پر ہے جسکا گورنر ایک دیسی ہے جس سے ہر ایک سمجھدار ہندوستانی کو یقین ہوتا جاتا ہے۔ کہ جب تک گورنمنٹ کی باگ ڈور ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہ آئے۔ خاص خاص ہندوستانیوں کا عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہو جانا نہ صرف ہمارے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہے۔ انگریزوں نے اب یہ پالیسی اختیار کی ہے۔ کہ وہ اپنے ہم خیال ہندوستانیوں کو بڑے بڑے عہدے دے کر ان سے وہ غلیظ کام کروائیں جو وہ پہلے خود کرتے تھے۔ ہمارے بھولے بھائی اس جال میں پھنس گئے۔ اور جہاں اُن کو آج اس بات کا فخر ہے۔ کہ وہ گورنمنٹ وقت کے ذمہ دار عہدہ دار بن کر گورنمنٹ کے مددگار ہیں۔ وہاں اُن کو یہ بھی فخر ہوگا۔ کہ وہ ان ہندوستانیوں پر سختی کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں۔ جو ملک کی آزادی کی خاطر جدوجہد کر رہے ہیں۔ میرا یہ یقین ہے کہ خواہ ایک وکیل بھی وکالت نہ چھوڑے اور ایک بھی لڑکا سکولوں اور کالجوں سے نہ نکلے اور ایک بھی خطاب یافتہ اپنا خطاب نہ چھوڑے ترکِ موالات کی پالیسی کبھی ناکامیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کی بنیاد سچائی پر ہے اور سچائی آخر کامیاب ہوتی ہے +

میرے ہموطنو! اگر آزادی چاہتے ہو۔ اور سوراجیہ چاہتے ہو۔ اگر یہ چاہتے ہو۔ کہ اس کے بعد کبھی کسی دُنیاوی طاقت کو اسلام کے جھنڈے کو بے عزت کرنے کی دلیری نہ ہو۔ اگر یہ چاہتے کہ آئندہ پھر کبھی اوڈوائر جیسے آدمی کو تمہاری عزت و آبرو کو خاک میں ملانے کا موقع نہ ملے۔ تو اس کا ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ یہ کہ تم ترکِ موالات پر اڑے رہو +

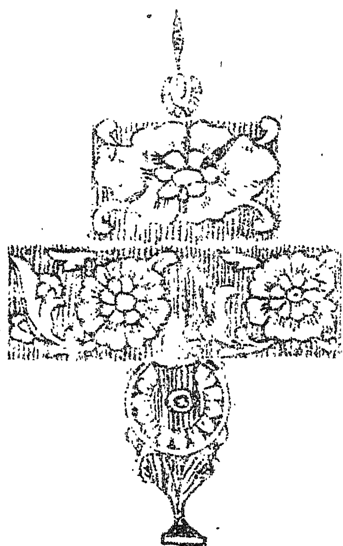
ہم کیا چاہتے ہیں؟ ہم سوراجیہ چاہتے ہیں۔ ہم اپنے ملک میں اپنی گورنمنٹ

بنانا چاہتے ہیں۔ جس کو مقرر کرنا اور برطرف کرنا ہمارے اختیار میں ہو۔

یہ سوراجیہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ ہندو مسلم اتحاد سے اور ترک موالات کی تمام باتوں کو پورا کرنے سے۔ جن میں سے سودیشی بڑی ضروری چیز ہے جب تک ہم اس بھروسہ پر رہیں گے کہ ہم کو سوراجیہ انگریزوں کی مہربانی سے حاصل ہوگا تب تک ہم کبھی کامیاب نہ ہونگے۔ کامیابی کا راستہ یہی ہے کہ ہم اپنے آپ پر بھروسہ کرنا سیکھیں۔ اور اس ظالم اور غاصب گورنمنٹ سے ان تمام معاملات میں قطع تعلق کریں جو اس کی طاقت کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان سے نہ انصاف کی امید رکھیں اور نہ امداد کی۔ اپنی تعلیم کا خود بندوبست کریں جہاں تک کہ ہو سکتا ہے اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو ان کے زہریلے اثرات سے بچائیں۔ اپنے تنازعات کا خود فیصلہ کریں۔ سودیشی کا استعمال کریں۔ اور اپنی مزدوری پیشہ جماعت کے ساتھ محبت سے بھرا ہوا بامروت سلوک کریں ہماری طاقت اس میں ہے کہ ہم اپنے کثیر التعداد ہموطنوں کے دلوں کو تسخیر کریں ہماری طاقت اس میں نہیں ہے کہ ہمارے چند بھائی خواہ وہ پنڈت ہوں یا مولوی میاں ہوں یا لالہ بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہو کر انگریزوں کے معتمد بنیں۔ غلاموں کے اندر ممتاز ہونے سے آزادوں کے اندر ان کا خاک پا بن کر بیٹھنا بھی زیادہ عزت کا نشان ہے۔ غلامی کی زنجیریں خواہ آہنی ہوں خواہ سونے کی۔ آخر زنجیریں ہیں۔ آزادی کی ہوا خواہ جھونپڑی میں ہو خواہ محل میں آزادی ہی ہے۔ آزادی کی قدر وہی شخص جان سکتا ہے جس کے دل پر غلامی کی نفرت بیٹھی ہوئی ہو۔ اور جو اس سچائی کو مانتا ہو کہ سوادھین ہو کر مزدور بننا بہتر ہے۔ بہ نسبت اس راجہ کے بھی جو پرادھین ہے۔

اے دیویو! تم ہو جنھوں نے پراچین سمیوں میں اپنے بچوں۔ بھائیوں

اور خاوندوں کو دھرم یدھ میں بھیجا اور کہا تھا کہ "مرجانا مگر ہار کر واپس نہ آنا" آج پھر دھرم یدھ شروع ہے۔ کیا تم اپنے بچوں۔ بھائیوں اور خاوندوں کو اس میں شامل ہونے سے روکو گی؟ تمہاری عصمت کی رکھشا تمہارے پوروجوں کا دھرم کر رہا ہے۔ کیا اب اسی عصمت کو بچانے کے لئے تم اپنے جوانوں کو منع کرو گی؟ میں امید کرتا ہوں کہ تم پدماوتی کی طرح ثابت قدم ہو کر اشیرباد دو گی تاکہ ہماری فتح ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ماتاؤ! تم ایک ایک گاندھی پیدا کرو۔ اپنے بچوں کو سودیشی پہناؤ۔ اس دھرم یدھ کے سمے اپنے آرام و آسائش کو ملتوی کر دو۔ کھدر پہنو اور اس طرح اپنے دیش کی رکھشا کرو۔



پارٹیوں کا بیہودہ رواج

پنجاب کو دوسرے صوبجات کے مقابلہ میں یہ شرف حاصل ہے۔ کہ وہ خطابات کے یا سرکاری عہدوں کے ملنے پر بیحد خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ دوسرے صوبجات میں بھی ہندوستانیوں کو خطابات دیئے جاتے ہیں۔ اور اس صوبہ کے مقابلے میں زیادہ ممتاز عہدے بھی دیئے جاتے ہیں۔ مگر اس قدر خوشی کا اظہار کہیں سننے اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس موسم میں اس قدر پارٹیاں ہوئی ہیں۔ اور ان پارٹیوں میں اتنے لوگ بلالحاظ اپنے اصولوں کے شامل ہوتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ پھر اپنی کمزور آواز اس بیہودہ طریقہ کے برخلاف اٹھانا چاہتے ہیں۔ پہلی پارٹی لالہ ہرکشن لال نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے پریزیڈنٹ اور اس کے ممبران کی آنر (اعزاز) میں دی۔ اس پارٹی میں کئی ایسے اصحاب شامل ہوئے۔ جو اصولاً عدم تعاون کے حامی ہیں لیکن باوجود اس کے وہ اس پارٹی میں گئے۔ اور انہوں نے ارادتاً لالہ ہرکشن لال کو خوش کرنے کے لئے اپنے اس اصول کو توڑا۔ اس کے بعد اسی قسم کے کئی اصحاب گورنمنٹ ہاؤس کی بھی پارٹیوں میں گئے۔ اب حال میں دو اور پارٹیاں ہوئی ہیں۔ جو نئے مقرر شدہ دیسی ججان ہائیکورٹ کی آنر میں دی

گئیں ہم حیران ہیں کہ ان پارٹیوں کے کیا معنی ہیں۔ کیا یہ صاحبان جن کو یہ ججیاں عطا کی گئی ہیں۔ اس عہدے کے لائق نہ تھے۔ اور اس واسطے ان کے دوستوں نے خاص طور پر اظہار خوشی کی ضرورت سمجھی۔ یا یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ان تقرریوں پر پبلک کی خوشنودی کا اظہار کیا جائے؟ ہماری رائے میں یہ دونوں باتیں نہیں ہو سکتیں ہیں۔ وکلاء میں سے ہائیکورٹ کے جج مقرر ہونا ایک معمولی بات مقرر ہو گئی ہے۔ یہ بھی شکایت ہوتی رہی ہے کہ دیسی ججان کی تعداد کافی نہیں ہے۔ حالانکہ دیسی وکلاء میں سے اور دیسی ججان ماتحت میں سے بہت سے اس عہدے کے لائق ہیں۔ لیکن معمولی حالات میں کسی وکیل کا جج بنایا جانا کوئی ایسا خاص اعزاز نہیں ہے۔ جس پر وکلاء کی طرف سے یا عام پبلک کی طرف سے اظہار خوشی کیا جائے۔ ہماری رائے میں اس قسم کا اظہار خوشی ان صاحبان کے اعزاز کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح سے یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کو جو عزت دی گئی۔ اس کے وہ مستحق نہ تھے۔ گورنمنٹ نے ان کو مقرر کر کے صوبے پر کوئی خاص احسان نہیں کیا۔ نہ وکیلوں پر کوئی خاص احسان کیا ہے۔ ایسی حالت میں ان تقرریوں پر اظہار خوشی کے لئے پارٹیاں دینا ایک غیر معمولی طریقے کی خوشامد ہے۔ جس کو ہم از حد ناپسند کرتے ہیں۔ ان پارٹیوں میں جو لوگ جاتے ہیں وہ عموماً ایک ہی خواہش کے ہوتے ہیں۔ اور عموماً بلائے بھی ایک ہی قسم کے آدمی جاتے ہیں۔ اور ایک ہی قسم کے آتے ہیں۔ اس لئے ان کی حاضری کو پبلک کی خوشنودی یا غیر خوشنودی کا کوئی معیار سمجھنا بالکل لغو ہے۔

یہ بھی قابل نوٹ ہے کہ اس کثیر تعداد انگریز صاحبان میں سے جن کو بلایا جاتا ہے۔ صرف معدودے چند ان پارٹیوں میں آنے کی پرواہ کرتے ہیں۔ اگر اس قسم کی پارٹیاں دینے کی بجائے دوست پرائیویٹ طور پر اپنے دوستوں کی عزت کرنے کے لئے دعوتیں وغیرہ دیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن اس قسم کی نیم پبلک طور پر پارٹیاں

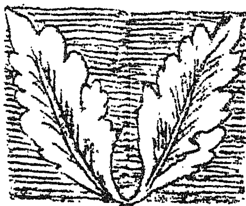
دینا بالکل بے معنی ہے اور غلط فہمی کے پیدا کرنے والا ہے۔ پبلک آجکل بالکل پرواہ نہیں کرتی کہ کون کس عہدے پر مقرر ہوتا ہے۔ وہ وقت جاتا رہا جبکہ ہائیکورٹ کی ججی پر کسی دیسی کا تقرر ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ بات معمولی ہے اور اس پر کسی خوشی کا اظہار کرنا بے محل ہے +

لیکن ہمارا اعتراض ان آدمیوں پر چنداں نہیں ہے جو اپنی اغراض کے لئے یا اپنے دوستوں کو خوش کرنے کے لئے یہ پارٹیاں دیتے ہیں۔ ہم کو زیادہ تر اعتراض ان لوگوں پر ہے جو اپنے اصولوں کے خلاف ان پارٹیوں میں جاتے ہیں۔ جب وہ ہمارے پلیٹ فارم پر آتے ہیں۔ تو وہ اپنے آپ کو نان کوآپریشن کے معتقد بتلاتے ہیں۔ لیکن جب پارٹی میں جاکر ایک ڈونا مٹھائی کھانے کا موقعہ ملتا ہے تو اپنے اصولوں کو فوراً بھول جاتے ہیں۔ ہم کو یہ بات نہایت رنج سے کہنی پڑتی ہے کہ ہندوستانی کیرکٹر میں خصوصاً تعلیم یافتہ لوگوں کے کیرکٹر میں ابھی یہ بات کافی طور پر پیدا نہیں ہوئی کہ وہ ظاہر اور باطن میں ایک رویہ اختیار کریں اور کیرکٹر کی مضبوطی کا ثبوت دیں +

عدم تعاون کے ریزولیوشن کے ماننے والوں میں بہت سے ایسے آدمی ہیں جن کو اس ریزولیوشن کے ایک دو دفعات پر اعتراض ہے۔ یا جن کو کوئی اعتراض ہے۔ مگر وہ اس قدر اخلاقی جرأت نہیں رکھتے کہ ریزولیوشن پر عمل کر سکیں۔ جن لوگوں کو خاص دفعات پر اعتراض ہے اگر وہ ان خاص دفعات پر عمل نہ کریں جن سے انکو مالی نقصان پہنچتا ہو۔ تب بھی ایک حد تک قابل معافی سمجھے جا سکتے ہیں۔ لیکن پارٹیوں میں جانا دونوں حالتوں میں قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ ان پارٹیوں میں جانے والوں میں ہزاروں آدمی ایسے ہیں جنہوں نے عدم تعاون کے ریزولیوشن کو اصولاً مانا ہوا ہے۔ اور کلکتہ کانگریس کے موقعہ پر اس کے حق میں

ووٹ دیا ہے۔ جن کا تعلق سرکاری پارٹیوں سے ہے۔ ایسے لوگوں کا ان پارٹیوں میں جانا نہایت قابل اعتراض ہے اور ہم نہایت ادب سے ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی اس اخلاقی کمزوری پر غالب آئیں +

جس حقارت سے انگریز صاحبان ان پارٹیوں کو دیکھتے ہیں۔ وہ اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہ ان میں سے بہت تھوڑے ان پارٹیوں میں آنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل نوٹ ہے کہ جب کبھی کوئی انگریز وکیل جج ہائیکورٹ بنایا جاتا ہے۔ تو کوئی شخص ان کو پارٹی نہیں دیتا۔ اور وہ کسی طرح سے اپنی تقرری کی منادی نہیں کراتے۔ پنجاب ہائیکورٹ کے وکیلوں یا بیرسٹروں میں سے کئی صاحبوں کو یہ عہدے مل چکے ہیں۔ اور جہاں تک ہم کو یاد ہے ان کے ہموطنوں نے کبھی ان کے اس تقرر پر باجے نہیں بجوائے۔ مگر جونہی ایک ہندوستانی مقرر ہوتا ہے۔ اس کے دوستوں کو اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ ایک مبالغہ آمیز طریقہ پر خوشی کا اظہار کریں۔ یہ ثبوت اس غلامانہ ذہنیت کا ہے۔ جس کو دور کرنا معلوم ہوتا ہے۔ ہماری طاقت سے باہر ہو گیا ہے +



ہندوؤں میں سوشل بھاؤ

دُنیا میں سب سے خوبصورت اور اچھنبے کی چیز منش ہے۔ اگر ہم منش کو قدرت کی تمام خوبصورتی کا ایک ظہور کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ انسان کے اندر مختلف قسم کی طاقتیں پنہاں ہیں۔ فلاسفروں اور انسانی دل و دماغ کے ماہروں نے ان انترشکتیوں کو سمجھنے کے واسطے بہتیری کوششیں کی ہیں۔ لیکن وہ ٹھیک طور پر اور کافی طور پر اس کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ انسان کیا ہے۔ دُنیا بھر کے لٹریچر میں اُسکا کوئی تسلّی بخش جواب ملنا مشکل ہے۔ یوروپ میں ایک وقت آیا جبکہ لوگ اِنسان کی پیدائش کو محض اتفاق سے تعبیر کرنے لگے ✤

اِنسان خواہ کچھ ہی ہو۔ لیکن اِس بات کو قدیم اور زمانہ حال کے محققوں نے تسلیم کیا ہے کہ انسان سوسائٹی کا ایک پُرزہ ہے۔ ہمارے پراچین شاستروں کے مطابق منشیہ پر نہ صرف اپنے آتما اور اپنے ماتا پتا کے سنسکاروں کا اثر ہی ہوتا ہے۔ بلکہ اُس سوسائٹی کے سنسکاروں کا بھی بڑے گہرے طور پر اس کے دِل پر اثر ہوتا ہے جس میں کہ اُس نے جنم لیا ہے۔ ہر ایک انسان اپنے اِرد گِرد کے حالات اور اثرات سے بنتا ہے۔ کوئی شخص سانوک بھاؤں سے کتنا ہی اُنت کیوں نہ ہو وہ سوشیل حالات سے بے اثر نہیں رہ سکتا۔ غرضیکہ ہر ایک انسان بلحاظ اچھے یا بُرے بھاؤں کے اپنی قوم کی تاریخ کا پرتی ندھی ہے ✤

زندگی ایک ہے۔ لیکن اس کے مختلف حصے ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ایک کا اثر دوسرے پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی واسطے پراچین آریہ زندگی کو مجموعی شکل سے دیکھتے تھے۔ بیشک کاربہ کھشیتر میں لوگ اپنے اپنے نشوونما کے مطابق کام کو تقسیم کر لیں۔ لیکن مجموعی اور قومی طور پر ایسی تقسیم ہرگز نہیں ہو سکتی جب کہ جاتی کے افراد ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہو جائیں +

چھاتے اور جوتے کے سوراخوں کو درست کرو

سوشیل ملکی۔ مذہبی۔ روحانی تقسیم مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے ہے۔ لیکن میری رائے میں سوشیل ترقی میں ہماری زندگی کے تمام پہلو شامل ہو جاتے ہیں۔ انسان سماج کی کل کا ایک پرزہ ہے۔ اور اگر اسے دنیا میں مناسب نشوونما پا کر کوئی مقررہ کام کرتا ہے تو وہ سماج میں سمشٹی روپ سے کام کر سکتا ہے۔ علیحدہ طور نہیں۔ سماج اور وہ ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ جب ایک قوم اپنی سوشیل ذہانیت (Social genius) پر دھیان دینے لگے۔ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قوم نے قومی ترقی کی۔ ا۔ ب۔ پ کو سیکھنا شروع کر دیا ہے +

جب ہم ہندو قوم کا دنیا کی دیگر قوموں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تو اپنی قوم کی حالت مجھے اس تھکے ماندے مسافر کی سی نظر آتی ہے۔ جو کہ لق و دق ریتلے بیابان میں جون کی کڑکتی ہوئی گرمی میں دوپہر کے وقت پیدل چل رہا ہو۔ جس کی چھتری میں سوراخ ہوں۔ اور جوتا ٹوٹا ہوا ہو۔ اوپر سے آفتاب کی تمازت اور نیچے سے زمین کی تپش اس کے جسم کو جلاتی اور تڑپاتی ہو۔ اور باقی قوموں کی حالت اس دھناڈیہ کی سی ہے۔ جو کہ عین آرام سے اپنی گاڑی

میں بیٹھا ہوا جا رہا ہے ×

جب اِس قسم کا راہ ماندہ مُسافر جس کی چھتری میں سوراخ ہیں۔ اور جس کا جُوتا ٹوٹا ہوا ہے۔ ایسے گاڑی میں سوار امیر کو دیکھتا ہے۔ تو اُس کے دِل میں دو خیال پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) دیکھو یہ آدمی کیسا سُکھی ہے۔ اِس کے ساتھ دوسرا خیال حسد کا پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے۔ کہ مَیں بھی اِس جیسا بن جاؤں۔ یا اگر وہ تنگ دِل ہے تو وہ خواہش کرے گا۔ کہ امیر بھی اُس جیسا ہو جائے۔ اِن دو خیالات کے علاوہ اِس کے دِل میں شاید ایک تیسرا خیال بھی آجاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہماری تقدیر میں ہی ایسا لکھا ہے۔ دھرماتما پُرش سوچتا ہے۔ کہ یہ امیر کیسے بڑھ گیا۔ اور یہ کیوں آرام میں ہے۔ اور خود بھی ایسا بننے کی تدابیر سوچتا ہے۔ لیکن نیچ پُرش اُس کو اپنی حالت میں لانا چاہتا ہے۔ دُنیا کی باقی قومیں آرام دہ گاڑیوں پر سوار جاہ و حشم سے اور اپنے پُورے جوبن میں دُنیا کے شاہراہ پر جا رہی ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ جن کے جُوتوں میں سوراخ اور چھتری میں بھی سوراخ نہیں اِسلئے ہماری سب سے پہلی کوشش نہ ہونی چاہیئے۔ کہ ہماری چھتری اور جُوتے کے سوراخ دُور ہو جائیں۔ یہ خیال ہے جو کہ قدرتی طور پر ہمارے سامنے آتا ہے

نقل ہندو قوم کو تباہ کر دیگی۔

اب سوال یہ ہے۔ کہ ہم کس طرح اپنی چھتری اور جُوتے کے سوراخوں کو دُور کر سکتے ہیں۔ بلکہ نئی چھتری اور جُوتا خرید سکتے ہیں۔ اُس کے لئے پہلا قدرتی خیال ہمارے دِل میں یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جس طرح سے باقی قومیں دُنیا میں بڑھی ہیں۔ اُسی طرح ہم بھی بڑھیں۔ لیکن اِن اسباب کا سمجھنا ایک مُشکل

کام ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہمارے دل میں یوروپ کی قوموں کی نقل کرنیکا خیال پیدا ہوتا ہے۔ میں اس بات کا مخالف نہیں ہوں۔ کہ آپ اچھی چیز جہاں سے ملے گرہن کریں۔ گیان اور وِدّیا دُنیا میں کسی کی وراثت نہیں ہے لیکن ساتھ ہی میں یہ کہنے سے نہیں رُک سکتا۔ کہ کسی قوم کے اچھے بھاؤں کو جذب کرنے اور اُس قوم کی نقل کرنے میں بڑا بھاری فرق ہے۔ یاد رکھو کہ اگرچہ انسان اصل سے بہتر نقل کر سکتا ہے۔ لیکن اصل میں جو جوہر ہے۔ وہ کبھی نقل میں نہیں آ سکتا۔ انگریزی ٹوپی پہن کر ہم انگریزوں کی شکل بنا سکتے ہیں۔ لیکن انگریز نہیں بن سکتے کسی قوم کے بیرونی چنہوں کو نقل کر کے ہم اس کے اصلی گنوں کو جذب نہیں کر سکتے۔ انگریزوں میں جو خوبیاں اور اوصاف ہزارہا برس کی کلچر سے پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ ہم میں محض نقل سے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ ہر ایک قوم اپنی تاریخ کی پرتی مذہبی ہے۔ ہندوؤں کے سامنے سوال یہ ہے۔ کہ آیا وہ نقل کر کے ہندو پن کو تیاگ دیں گے۔ یا اپنی کمیوں کو دُور کر کے ہندو بنیں رہیں گے۔ میں دعوے سے اور زور سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ نقل ہندو قوم کے لئے مفید نہیں ہو گی۔ ہم تبدیلی کی لہر کو روک نہیں سکتے۔ سوال یہ ہے۔ کہ آیا ہم تبدیلی کرتے ہوئے اصلیت کو بھی گم کر دیں گے۔ یا محض شکل کو ہی تبدیل کریں گے +

ہندو قوم کے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ کہ آیا ہم اپنے بزرگوں کی پراچین تہذیب کو قائم رکھیں گے۔ اور بیرونی میل کو اُتار کر اصلی جسم کو قائم رکھیں گے۔ یا اُس کلچر کو جو ہزاروں اور لاکھوں برسوں سے ہمیں ورثہ میں ملی ہے نیست و نابود کر دیں گے +

ہندو اور یوروپین تہذیب میں اختلاف ہے

یوروپ کی قومیں اِس میں شک نہیں شرافت - اخلاق - انسانیت اور میں کہوں گا رُوحانیت میں بھی ہم سے بڑھی ہوئی ہیں - میں نے کہا ہے کہ یوروپ رُوحانیت میں ہم سے بڑھا ہوا ہے - رُوحانیت کی ایک بھاری پرکھ یہ ہے کہ کوئی شخص اصُول کی خاطر اپنی زندگی اور جان و مال کو کہاں تک قربان کر سکتا ہے - ہمارے بزرگوں میں یہ قربانی کی سپرٹ موجود تھی لیکن ہم میں موجود نہیں ہے - اگر ہم اصول اور سچائی کی خاطر نقصان نہیں اٹھا سکتے - تو باوجود ویدوں اور شاستروں کے مالک ہونے سے میں کہہ سکتا ہوں - کہ ہم میں رُوحانیت نہیں ہے - یوروپ نواسیوں کو جب کبھی تشویر بیرونی اذمبروں کو قربان کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ ہم سے بہتر اِس بات کا ثبوت دیتے ہیں - اِس لئے نہ صرف جسمانی اور اخلاقی طور پر بلکہ رُوحانی طور پر بھی وہ ہم سے اونچے ہیں - لیکن باوجودیکہ یوروپ کی قومیں ہم سے اِس قدر اعلیٰ ہیں - ہمارے لئے اُن کی نقل زہر قاتل کے سمان ہے - یوروپین تہذیب اور ہندو تہذیب میں ایک بھاری بھید ہے - جس کے لئے مجھے اور آپ کو بڑا فخر ہونا چاہیئے - اگر ہم یوروپین تہذیب کی نقل کریں گے تو وہ فخر جاتا رہیگا لیکن اگر اِس بھید کو رکھتے ہوئے ہم اپنی کمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے تو یہ ہماری قومی ہستی کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا +

یوروپین تہذیب کی بُنیاد حقوق پر ہے

انقلاب فرانس کی بُنیادیں اُس عالی دماغ یُوروپین کے خیالات پائے

جاتے ہیں جس نے کہ یورپ کو بتایا۔ کہ تمام انسانوں کے حقوق مساوی ہیں۔ اور تمام یوروپین تہذیب کی بُنیاد حقوق کی مُساوات پر ہے۔ لیکن ہماری تمام کلچر کی بُنیاد میں فرض (دھرم) کا خیال ہمیشہ پردھان رہا ہے۔ ایک طرف زندگی بھوگ کے لئے ہے دُوسری طرف دھرم پالن کے لئے۔ ایک طرف زندگی عیش و عشرت کے لئے ہے اور دُوسری طرف آئندہ زندگی کو اُونچا کرنے کے لئے۔ لیکن یاد رکھو۔ کہ دُنیا کو کبھی حقوق میں سُکھ کی پراپتی نہ ہوگی۔ اور وہ سوسائٹی اور قوم کبھی نہیں بڑھے گی۔ جو کہ حقوق کو اپنی زندگی میں نمایاں درجہ دیتی ہے۔ جب تک لوگوں کے اندر پُورے طور پر حقوق طلبی کے خیال نے زور نہیں ڈالا تب تک یورپین قوموں میں گٹھت رہی۔ لیکن اِس خیال کے پیدا ہوتے ہی یوروپ میں ایک کولاہل سا مچ گیا۔ اور یوروپ میں سرمایہ داروں اور مزدوری پیشہ لوگوں کے درمیان نت نئے جنگ بتاتے ہیں۔ کہ یوروپین تہذیب زندگی کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگی۔ اس سوال کو تمام دُنیا حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔ کہ یوروپ کے لوگ اِس مشکل سے کیسے باہر نکلتے ہیں؟

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر تمام انسان مساوی ہیں۔ تو ہم عملی دُنیا میں یہ نظارہ کیوں دیکھتے ہیں۔ کہ ایک مخمل کے گدیلوں پر آرام کرتا ہے۔ اُس کے کُتّوں کو وہ کھانا ملتا ہے۔ اور وہ آرام نصیب ہے۔ جو کہ ایک دُوسرے انسان کو بھی نہیں اور دوسری طرف انسان ایسے ہیں۔ جن کو ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے؟

یوروپ میں ذاتوں کی پیدائش

یوروپ کی موجودہ کولاہل کا سب سے بڑا کارن مشینری ہے۔ مشینری نے سرمایہ داروں کی طاقت کو بیس گنا سو گنا بلکہ ہزار گنا بڑھا دیا ہے۔ جہاں پہلے دو سو

مزدوروں کی ضرورت پڑتی تھی - وہاں اب مشینری کی ایجاد سے دو مزدوروں سے کام چل سکتا ہے - پچھلے دنوں یورپ میں جو کوئلے کے مزدوروں نے ہڑتال کی تھی - وہ موجودہ کو اہل کا ایک پریکٹیکل ثبوت ہے - یورپ میں بھی ہماری طرح ذاتیں بن رہی ہیں جن کو ان کی اصلاح میں ٹریڈ یونین (trade union) کہتے ہیں - درزیوں کی علیحدہ ٹریڈ یونین ہوتی ہے - ترکھانوں - لوہاروں - کانوں میں کام کرنے والوں وغیرہ کی اپنی اپنی ٹریڈ یونین ہوتی ہیں - کوئی آدمی کسی کارخانہ میں کام نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے پیشہ کی ٹریڈ یونین کا ممبر نہ ہو - ورنہ اگر کسی کارخانہ والے اس کو ملازم رکھ بھی لیں - تو اس کی ذات کے لوگ اس کارخانہ میں ہڑتال کر دیتے ہیں - ان ٹریڈ یونین میں ابھی تک تعلقات محض سوشل ہی ہیں اور ہماری ذاتوں کی طرح شادی وغیرہ کی پابندی نہیں - لیکن وقت آئے گا جبکہ ہماری طرح ان میں بھی شادی وغیرہ کے تعلقات پیدا ہو جائیں گے - کچھ عرصہ گذرا مجھے ایک انگریز ودوان سے اسی کے متعلق بات چیت کرنے کا موقعہ ملا - اس وقت میں نے ان سے کہا - کہ ہم کو ذاتوں نے مارا - اور تم کو تمہاری ذاتیں ماریں گی ۔

انگلستان اور یورپ کے دیگر ملکوں میں ٹریڈ یونین ایک بھاری طاقت ہیں اور گورنمنٹ وقتاً ان کی پولیٹیکل طاقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی - یورپ میں ایک زبردست فریق پیدا ہو گیا ہے جس کو سوشلسٹ کہتے ہیں - اس فریق کے حامی کہتے ہیں کہ دنیا میں تمام انسان مساوی ہیں - اور اس لئے دولت کی تقسیم تمام میں مساوی ہونی چاہئے - ان کا خیال ہے - کہ دولت کمانے کے تمام ذریعے گورنمنٹ کی طرف سے ہونے چاہئیں یعنی ریلیں - کارخانے وغیرہ تمام گورنمنٹ کے اپنے ہونے چاہئیں - گورنمنٹ خود کام کرے - اور لوگوں کو ان کے گذارہ کے موافق روٹی دے - یہ سوال ہستی کا نہیں ہے - یورپ کے واسطے یہ سوال زندگی اور

موت کا سوال ہے۔ اور آئندہ دس سال میں یہ سوال یورپ میں معرکے پیدا کریگا۔

کیا ہندوستان کے لئے مشنری مفید ہے؟

بھارت ورش میں بھی یہی دقتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور ہونگی۔ بھارت ورش کے واسطے مشنری کے استعمال کرنے کا سوال ایک ضروری اور عمل مطلب سوال ہے اگر مشنری نہ منگائی جائے تو ہندوستان کی صنعت و حرفت مُردہ ہو جائے گی۔ ہمیں اپنی تمام ضروریات کے لئے غیر ممالک کا دست نگر ہونا پڑے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہندوستان غریب اور مفلس ہو جائے گا۔ اور اگر مشنری منگائی جائے تو ہمارے درمیان بھی اُسی قسم کا کولاہل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ جو کہ آجکل یورپ میں پیدا ہو رہا ہے۔ میں اس سوال کا حل نہیں بتا سکتا۔ لیکن ہاں میں آپ سے ایک بات کی درخواست کرونگا۔ کہ آپ پراچین ہندو دھرم کے مطابق اس کا حل ڈھونڈیں۔ اگر ہم آج تک قومی طور پر زندہ ہیں۔ تو اُسی سوشل سسٹم کے طفیل سے یہ ایک عجیب منطق ہے۔ کہ جس سوشل سسٹم نے ہمیں مارا۔ وہی ہماری زندگی کا باعث ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اِن اصولوں کو چھوڑ دیں جن پر کہ وہ سوشل سسٹم مبنی تھا۔

مثال کے طور پر ویدک زمانہ میں ذات پات کی تقسیم اتنی کڑی نہ تھی لیکن جب وقت ہندوؤں پر ایک غیر طاقت نے حملہ کیا۔ تو ہندو تہذیب کو بچانے کے لئے جکڑ بندیاں بنائی گئیں۔ وہ صرف ایک عارضی غرض تھی۔ لیکن ہم نے اس ذریعہ کو بذات خود مدعا سمجھ لیا ہے جس کمال درجے کی تقسیم آریہ جاتی نے کی۔ دُنیا کے پردہ پر موجود نہیں ہے۔ چار پردھان شکتیوں کو اُنہوں نے چار جاتیوں میں تقسیم کر دیا۔ پراچین آریوں کی سوشل ذہانت (Social genius) نے وہ

تمام چیزیں معلوم کی ہوئی تھیں جن کی بابت کہ یوروپ کے لوگ اب سوچ رہے ہیں +

ہم بطور ہندو کے زندہ رہینگے

یہ سوال مرغوں کی مانند لڑنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے صحیح حل پر اس بات کا مدار ہے۔ کہ آیا ہم ہندو بن کر جئیں گے۔ یا غیر ہندوؤں کے طور پر۔ کیا ہم ہندو جیون کو اس واسطے چھوڑ دیں گے۔ کہ اس پر گرد پڑ گئی ہے۔ میں بہتر سمجھونگا۔ کہ ہم ہزارہا سال غلامی میں رہیں۔ اور ہندو رہیں۔ بہ نسبت کہ ہم غیر ہندو کے طور پر زندہ رہیں۔ ہمیں اپنی قدیم ہندو تہذیب پر فخر ہونا چاہیئے۔ ہماری تہذیب کا اثر دُنیا پر پڑا ہے۔ جاپان اور چین اس کے خوشہ چین رہے ہیں +

کیا ہم بیرونی اڈمبروں سے متاثر ہو کر اس نئی تہذیب کو گرہن کریں گے۔ اور جس تہذیب کو ہم نے آندھی۔ طوفان۔ مصیبت۔ جنگ و جدل اور فاقہ کشی میں محفوظ رکھا ہے۔ عارضی فوائد کے لئے تیاگ دیں گے۔ بہتر ہے۔ کہ ہم اپنی قومی شخصیت کو قائم رکھیں۔ بجائے اس کے کہ دوسروں کی نقل کریں وہ شخص بہتر ہے۔ جو کہ اپنی شخصیت پر فخر کرتا ہے۔ آج گو وہ کمزور ناقص اور پاپی ہے لیکن اُس کے اندر بڑائی کے جرثوم موجود ہیں۔ جس سے وہ خود اُنت ہو سکتا ہے اور دوسروں کو اُنت کر سکتا ہے۔ چھوٹے درجے میں بڑا ہونا بہتر ہے۔ بہ نسبت بڑے درجے میں رذیل ہونے کے یاد رکھو۔ دُنیا یہ نہ کہے۔ کہ ہم نے اپنے لالچ اور بیوقوفی سے اپنی قیمتی تہذیب کو لالچ کے بھاؤ بیچ دیا +

سچے براہمنوں کی ضرورت ہے

ہندو جاتی کو اس وقت ایک ایسی سوچنے والی جماعت کی ضرورت ہے

جو کہ پراچین براہمنوں کی طرح تیاگی اور ساتوک ہو۔ اور جس کے من میں سوائے ودیا اور گیان کے اور کسی چیز کی ابھلاشا نہ ہو کوئی قوم کامیاب نہیں ہوئی۔ جس کا دماغ شدھ اور پوتر نہیں۔ منو مہاراج نے کہا ہے برہمن کے لئے سب سے مہلک زہر اپنی تعریف سُننا ہے۔ یہ زہر اُس کے برہمنتو کو نشٹ کر دیتا ہے۔ پراچین براہمن کاریہ کھشیتر میں نہیں آتے تھے۔ براہمن دُنیاداری سے علیحدہ ہونے چاہئیں۔ دُنیادار بعض دفعہ سچائی کا خون کر دیتا ہے لیکن وُہ شدھ دماغ جو کاریہ کھشیتر سے علیحدہ ہو۔ قوم کے سامنے صداقتیں پیش کرتا ہے۔ ایسی جماعت جب تک پیدا نہ ہوگی۔ ہم کبھی ترقی کے راستے پر چلنے کی اُمید نہیں کر سکتے ✣

ایسے لوگ اپنی شاندار علیحدگی میں قوم کے نفع و نقصان کی بات سوچیں اُن کی رُوحانیت میں کوئی دُنیاوی نفع و نقصان کا خیال نہ ہو بلکہ محض سچائی کا خیال ہو۔ ہندو قوم میں اس قسم کے دماغ پیدا ہوتے رہے۔ جنھوں نے دُنیا کو چکا چوند کر دیا تھا۔ لیکن جب سے براہمنوں کی جماعت نے کرم کانڈ شروع کر دیا۔ اُن کی بُدھی ویسی صاف نہ رہی ✣

پبلک لائف میں دھرم کی ضرورت

ہم اس وقت ایک عجیب گڑبڑ کی حالت میں ہیں۔ ہماری کھچڑی ایک عجیب کھچڑی ہے۔ ہماری مریادا نشٹ ہو رہی ہے۔ پرانے سسٹم کو ہم نے توڑ دیا۔ نئے سسٹم میں بدنظمی آ گئی ہے۔ اس گڑبڑ میں مجھے اندیشہ ہے کہ ہم کہیں نام۔ شہرت اور طاقت کے پیچھے اُس آبدار موتی کو نہ کھو دیں۔ جو کہ ہزاروں سالوں کے گذر جانے کے باوجود اب تک موجود ہے

وہ موتی دھرم کا پردھان خیال ہے۔ جو کہ آپ کی تہذیب کی نیو ہیں ہے ✤ اِس دھرم کے خیال کو زندگی میں جگہ دو۔ لیکن پبلک لائف میں وہ لوگ آئیں۔ جو کہ قوم کی سیوا کرنا چاہتے ہوں۔ جن کے اندر قربانی کا مادہ ہو۔ پبلک لائف سرکاری ملازمتوں کی طرح خراب ہو سکتی ہے۔ پبلک لائف سخت ذمہ داری کا کام ہے۔ میدان میں آئیں وہ لوگ جن کی زندگی پوتر ہے ہم اُن کے قدم چومیں گے۔ لیکن پرماتما کے واسطے ہندو جاتی کے نام پر اُس کو قتل مت کرو۔ پرماتما کے واسطے ہندو جاتی کو گڑھے میں مت ڈالو۔ پراچین پبلک لائف کے طریقے پر میدان میں نکلو۔ اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو بہتر ہے کہ ہم گھر میں بیٹھے رہیں۔ بجائے اس کے کہ پبلک لائف کے نام پر ہم گڑھے میں جا گریں ✤

ہندو قوم کی نازک حالت

ہم اس وقت ایک نازک حالت میں ہیں۔ چاروں طرف سے ہم مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سے مخالف طاقتیں ہمیں ہڑپ کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں چھوٹی ذاتیں ہمارے اندر سے آہستہ آہستہ نکل رہی ہیں۔ گھٹتے ہندو منڈل ہیں۔ جو کہ اس کو محسوس کرتے ہیں۔ پیارے بھائیو! پبلک لائف کو شدھ کرو۔ اور ذاتی کمزوریوں سے اسکو بالاتر کر دو ✤



ریفارم سکیم کے سر سہرا

گذشتہ دو سال میں جو مالی نقصان ہندوستان کو گورنمنٹ آف انڈیا اور سیکرٹری آف سٹیٹ کی مالی پالیسی سے ہوا ہے۔ وہ شاید انگریزی عملداری کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ جس وقت میں فروری ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس آیا تھا۔ پونڈ کی قیمت قریباً سات یا آٹھ روپے تھی۔ اس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے دس روپے مقرر کی۔ جو اب تک سرکاری قیمت ہے۔ مگر پونڈ کی بازاری قیمت سترہ یا اٹھارہ روپیہ ہے۔ جو آج تک پونڈ کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی۔ جب تک پونڈ کی قیمت سستی رہی گورنمنٹ آف انڈیا نے کروڑوں روپیہ کی ہنڈیاں فروخت کیں۔ جن سے سستی قیمت پر کروڑہا روپیہ انگلستان کو منتقل کیا گیا۔ ہندوستانی سوداگروں نے اسکے برخلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر گورنمنٹ نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی۔ گذشتہ دو سال میں گورنمنٹ آف انڈیا کی کرنسی پالیسی نے لاکھوں ہندوستانیوں کو تباہ کر دیا۔ اور ان کو امیر سے مفلس بنا دیا۔ اگر کسی پارلیمنٹری ملک میں کوئی مالی وزیر ایسا کرتا تو پبلک اس کو استعفا دینے پر مجبور کر دیتی۔ مگر ہندوستان کی کونسلوں میں ماڈریٹوں نے آنریبل مسٹر ہیلی کی تعریف کے پل باندھ دیئے ان کونسلوں کے اجلاس کے دوران میں ایک بھی تقریر ایسی نہ ہوئی جو کسی صورت میں مرحوم گوکھلے۔ پنڈت مدن موہن مالوی۔ مسٹر راگھو چاریہ یا فیروز شاہ کی تقریروں کے ہم پایہ کہی جا سکتی۔ یہ کونسلیں

ہندوستانیوں کو گورنمنٹ کی کرنسی پالیسی کے تباہ کن نتائج سے محفوظ کرنے میں کلیتہً ناکام رہیں۔ اس پر اب طرہ یہ ہے۔ کہ وزیر ہند نے انگلستان میں ایک قرض لیا جس کا سود سات فیصدی سالانہ منظور کیا گیا۔ آج تک گورنمنٹ آف انڈیا نے کوئی قرض ہندوستان میں ایسا نہیں لیا جس کا سود (لڑائی کے دوران میں بھی) اس قدر زیادہ دیا گیا ہو غالباً انگلستان میں بھی کبھی کوئی ایسا سرکاری قرض نہیں لیا گیا۔ جس پر اس قدر گراں سود دیا گیا ہو۔ بمبئی کے سوداگروں نے دو تین دفعہ اس زیادتی کے برخلاف اپنی آواز اٹھائی۔ گورنمنٹ نے جواب میں صرف یہ کہدیا کہ ہم کو اس سے کم سود پر قرض ملنے کی امید نہ تھی اور اس لئے ہم نے یہ شرح سود منظور کی۔ ہندوستان کی کونسلیں خاموش ہیں۔ اب انگلستان میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ تمام روپیہ جو قرض لیا گیا ہے۔ وہ انگلستان میں انگلستان کے بنے ہوئے سامان کے خرید کرنے پر خرچ کیا جائے یہ طریقہ ہے جس سے ہندوستان قریباً سو سال سے لوٹا جا رہا ہے۔ انگلستان کو نہ صرف ان قرضہ جات کی رقموں کا سود ہندوستان سے ملتا ہے۔ بلکہ جو فائدہ انگلستان کو ان قرضہ جات کے انگلستان میں خرچ کرنے سے ہوتا ہے وہ بے اندازہ ہے۔ انگریزی کارخانہ دار۔ انگریزی دلال۔ انگریزی ساہوکار۔ انگریزی انشورنس کمپنیاں انگریزی جہازراں کمپنیاں وغیرہ سب کی سب ہی اس قدر فائدہ اٹھاتی ہیں۔ کہ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کے پلے روپیہ میں سے ۱۲ آنے یا ۸ آنے بھی نہیں پڑتے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ نئی سکیم کے مطابق انگلستان میں ایک کمشنر مقرر کیا گیا ہے۔ جو گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے ضروری سامان خرید کرتا ہے۔ اس نے حال میں کچھ مشنری امریکہ سے خرید کی۔ جس پر پارلیمنٹ میں کئی بار اعتراض ہو چکا ہے۔ ابھی حال میں ایک ممبر کے سوال کے جواب میں وزیر ہند نے تسلیم کیا کہ جس وقت قرض اٹھایا گیا تھا تو یہ مشتہر کیا گیا تھا۔ کہ وہ تمام کا تمام انگلستان میں خرچ کیا جائے گا اور اس میں سے

۹ لاکھ پونڈ خرچ ہو چکا ہے ۔

گویا اس کے یہ معنے ہیں کہ ایک ساہوکار اوّل تو ہم کو اپنے مقرر کردہ سود پر قرض لینے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اور پھر وہ روپیہ بھی نقد نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے عوض میں اپنا بنا ہوا سامان اپنی مقرر کردہ قیمت پر خریدنے کے لئے مجبور کرتا ہے ۔

سر ڈنشا واچا جو ہندوستان کے قابل ترین مالی ماہروں میں سے ہیں۔ وہ بیسیوں دفعہ گورنمنٹ کی ریلوے پالیسی کے برخلاف تحریر و تقریر میں اعتراض کر چکے ہیں۔ یہ قرض بھی ریلوے کی اغراض کے لئے لیا گیا۔ ہم حیران ہیں کہ اس نئی ریفارم سکیم نے اُن پر کیسا جادو پھیلایا ہے۔ کہ اُنہوں نے اس پالیسی کے برخلاف آواز بلند نہیں کی ہمارے دیسی ممبران کونسل اور وزیر قریباً ہر روز عدم تعاون کے خلاف تقریریں کرتے ہیں اور قوم پرستوں کو جیل میں بھیجنے کے لئے رائے دے رہے ہیں۔ وہ اپنی اس پالیسی پر نازاں ہے۔ مگر دوسری طرف جوان کا گھر لٹتا جا رہا ہے۔ اُس پر دھیمی سی آواز میں نکتہ چینی کرنے پر قناعت کر رہے ہیں۔ اس نئی سکیم سے پہلے یہ ماڈریٹ لیڈر ہندوستان کی غربت کا نقشہ کھینچ کر رو دیا کرتے تھے اور اپنے سامعین کو بھی رُلایا کرتے تھے۔ ہمارے بزرگ نوروزجی اور رمیش چندر دت نے اس بارہ میں جو خدمات کی ہیں اُن کا تو ذکر ہی کیا۔ گورنر سنہا بھی گورنر بننے سے پہلے اور مسٹر چنتامنی بھی وزیر بننے سے پہلے ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اور قریباً سارے ماڈریٹ لیڈر اس بارہ میں اپنا فرض نہایت خلوص دل سے بجا لاتے تھے۔ مگر اب نئی ریفارم سکیم کے جادو میں مقابلتہً خاموش بیٹھے ہیں ۔

ہندوستان اس بوجھ کے نیچے دبا جا رہا ہے۔ اور ہندوستانی کاروباری آدمیوں پر انگلستان کے لوگ اور گورنمنٹ بدعہدی کا الزام لگا رہی ہے۔ مگر ہمارے یہ لیڈر اب گورنمنٹ کے ممتاز وزیر ہو جانے کے بعد خاموش ہیں۔ یا کم از کم اپنے فرض

کو مناسب طریقہ سے بجا نہیں لاتے ٭

انگریز بڑے دانا ہیں وہ ہندوستانیوں کو چند نمائشی چیزیں دیکر اصل تنتو کی چیز کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور اپنے خطبہ جات سے قوم کے سمجھدار حصے کے منہ پر مہر لگا دیتے ہیں۔ جو نئے عہدے انہوں نے ہندوستانیوں کو دیئے۔ اس سے انکا کیا نقصان ہوا۔ یہ خرچ ہندوستانی رعایا کی گردن پر ایزاد ہو گیا۔ گورنمنٹ کی مالی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور ہندوستانی لیڈران عہدوں پر ممتاز ہونے کے سبب خوش ہو گئے اور اپنے ہی دوسرے قوم پرست ہموطنوں کی تباہی و بربادی کے اوزار بن گئے۔ ہماری قسمت پر خربوزہ و چھری کی مثال صادق آتی ہے جب تک ہندوستان کو سوراجیہ نہیں ملتا چند ہندوستانیوں کا سرکاری عہدوں پر ممتاز ہو جانا یا کونسلوں کو معمولی قانونی اختیارات مل جانے سے ہمارا کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس قسم کی نیم دلی کی پالیسی سے ہم کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ ایک طرف تو گورنمنٹ کی تشدد کی پالیسی دیکھئے۔ دوسری طرف گورنمنٹ کی کرنسی اور مالی پالیسی پر غور کیجئے۔ اور پھر نتیجہ نکالئے۔ کہ اس ریفارم سکیم سے ہمارے ملک کو کیا فائدہ پہنچا۔ اس پر بھی ہمارے اپنے لیڈر یہ کہتے ہیں کہ اس ریفارم سکیم سے ہندوستانیوں کو کم از کم صوبجات میں سلف گورنمنٹ مل گئی ٭



قومی گناہ

اخلاق اور پاپ پن کا خیال مختلف زمانے میں مختلف رہا ہے اور وقت زمانے اور ملک کے لحاظ سے اس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اصول ایسے بھی ہیں۔ جنہیں ہر زمانے اور ہر ملک میں یکساں بزرگی دی جاتی رہی ہے۔ لیکن ان کی اہمیت میں بھی زمانہ اور وقت کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ مثلاً منوسمرتی کے زمانے میں شرابنوشی کو ایک ایسا زبردست گناہ اور جرم سمجھا جاتا تھا۔ کہ اس کی سزا موت رکھی گئی تھی۔ لیکن آج کل اگرچہ شراب نوشی کو بُرا اور گناہ تو خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن محض اتنا کہ شراب پینے والے کو بدچلن کہدیا جائے۔ اور اس سے زیادہ اور کوئی سزا اُس کے لئے ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ اسی طرح جھوٹ اور دیگر اخلاقی برائیوں کی نسبت کہا جا سکتا ہے

سوسائٹی میں یہ خیال کس طرح بدلتا ہے

اب میں آپکو بتاتا ہوں۔ کہ اخلاق اور پاپ پن کے متعلق سوسائٹی میں یہ خیال کس طرح تبدیلی پاتا ہے۔ سب سے پہلے ایک یا چند آدمیوں کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ جس بات کو سوسائٹی خراب سمجھتی ہے۔ وہ درحقیقت کچھ ایسی زیادہ خراب نہیں۔ کہ سوسائٹی اس کے کرنیوالے کو ایسی سخت سزائیں دے

وہ اپنے اس خیال کو سرگوشیوں میں خفیہ طور پر اپنے دوست اور احباب پر ظاہر کرتے ہیں۔ مگر دل میں ہمیشہ یہ خوف کھاتے ہیں کہ کوئی مخالف نہ سُن لے اور اس اختلاف رائے کا انہیں خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ مخالفت بڑھتی جاتی ہے۔ اور ان مخالفوں میں چند ایسے من چلے اور جری لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو اپنی ضمیر کی آواز کی پیروی میں سوسائٹی کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں اور مظالم برداشت کرتے ہیں۔ لیکن اپنے خیالات کا آزادانہ طور پر پرچار کرنے سے باز نہیں رہتے۔ سوسائٹی ان پر ہر طرح کے ظلم روا رکھتی ہے۔ مگر وہ اپنی دُھن میں مست رہتے ہیں۔ اور سب ظلموں کو برداشت کرتے ہیں۔ غرضیکہ دُنیا میں اصلاح ہمیشہ اسی طرح ہوا کرتی ہے ؎

سوسائٹی اور گورنمنٹ

جو حالت اصلاحات کے متعلق سوسائٹی کی ہے۔ وہی گورنمنٹ کی بھی ہے۔ دُنیا کی تمام گورنمنٹوں کا یہ ایک قدرتی خاصہ ہے۔ کہ وہ کوئی تبدیلی پسند نہیں کرتیں وہ ہمیشہ یہ چاہتی ہیں کہ ان کے اختیارات جلتے ہیں ان میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔ بلکہ برخلاف اس کے رعایا کے حقوق کم ہوتے جائیں اور ان کے اختیارات بڑھتے جائیں۔ گورنمنٹیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک قومی اور دوسری غیر قومی۔ جن ممالک کی گورنمنٹیں قومی ہیں۔ اُن کی گذشتہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان ممالک کی رعایا کو بھی اپنے حقوق حاصل کرنے میں کچھ کم دقتیں واقع نہیں ہوئیں۔ مثلاً انگلستان کی گورنمنٹ کو ہی لو جو کہ اس وقت ایک نہایت آزاد قومی گورنمنٹ سمجھی جاتی ہے۔ اس کی ہمیشہ سے ہی یہ حالت نہیں رہی گذشتہ ڈیڑھ سو دو سو سال کے اندر گورنمنٹ انگلستان کو اس کی موجودہ حالت

تک پہنچانے کے لئے وہاں کے محبان وطن کو بھی کچھ کم مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی جدّوجہد بھی کوئی ایسا آسان کھیل نہیں۔ جیساکہ ہمارے بعض آرام پسند پولیٹیشن سمجھے بیٹھے ہیں۔ جو یہ چاہتے ہیں۔ کہ پانچ پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ بھی جیب میں ڈالتے رہیں۔ اور گورنمنٹ میں اصلاح بھی کرتے رہیں۔ ایک غیر ملکی گورنمنٹ میں جیسی کہ ہماری ہندوستان کی گورنمنٹ ہے۔ اصلاح کرانے کے لئے اس سے بدرجہا زیادہ جدّوجہد کی ضرورت ہے جو کہ ایک قومی گورنمنٹ کی اصلاح کے لئے ضروری ہوتی ہے +

غیر قومی گورنمنٹ کی اصلاح کی مشکلات

اس کی اصلاح چاہنے والوں کو جہاں ایک طرف غیر ملکی حکام کے نامناسب احکام کے خلاف جدّوجہد کرنی پڑتی ہے۔ وہاں دوسری طرف ہم قوم کے بھائیوں کو بھی اپنا ہمراز بنانے کے لئے کوشش کرنی ہوتی ہے۔ اس طرح اُن کو دُگنا کام کرنا پڑتا ہے۔ انہیں سوسائٹی میں یہ خیال پیدا کرنا پڑتا ہے۔ کہ فلاں قانون کا ماننا ہمارے لئے پاپ ہے بڑا پاپ ہے اور ایک ایسا پاپ ہے جو کہ ہماری شخصیت کے خلاف ہی نہیں۔ بلکہ ہماری قومی ہستی کے برخلاف ایک زبردست پاپ ہے۔ یہ خیال اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں میں پیدا کرنے کے لئے دنیا کی تاریخ میں سینکڑوں بڑے اور چھوٹے آدمیوں سے تکلیفیں جھیلی ہیں۔ ملک میں یہ خیال پیدا کرنے اور پبلک رائے کو تیز کرنے کے لئے ہمیشہ بھاری صدموں کی ضرورت پڑا کرتی ہے۔ اور صدمے ان لوگوں کی قربانیوں سے پہنچتے ہیں۔ جو جو کہ اپنی ضمیر کی پیروی میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ اور اپنا جان ومال سب کچھ قربان کردیتے ہیں +

کیا بدیشی کپڑے کا نہ جلانا پاپ نہیں؟

میں نے یہ بحث آپ کے روبرو اس لئے پیش کی ہے۔ کہ بعض اخبارات میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ بدیشی کپڑے کا نہ جلانا پاپ نہیں۔ میری رائے میں جو شخص یہ مانتا ہے کہ اسے سودیشی کی صنعت کو ترقی دینا چاہئے یا سودیشی کپڑے کا استعمال اُس کے لئے دھرم ہے تو وہ نادانستہ طور پر اس امر کا اعتراف کرتا ہے۔ کہ اسے بدیشی کپڑے کی ترقی کو روکنا چاہئے۔ اور اس کپڑے کا استعمال کرنا اس کے لئے ادھرم اور پاپ ہے۔ میری رائے میں جو شخص ایمانداری سے یہ سمجھتا ہے کہ سودیشی کپڑے کی صنعت کو ترقی دینا۔ اس کی حفاظت کرنا اور اسکا استعمال کرنا اس کا فرض اور دھرم نہیں۔ وہ بدیشی کپڑا استعمال کر سکتا ہے۔ گو ایسا کرنے میں بھی وہ اپنی قومی ہستی کے خلاف ایک سخت گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور ایک سخت پاپ کرتا ہے۔ لیکن جو شخص سودیشی کپڑے کے استعمال کو اپنا فرض اور دھرم سمجھ کر بھی اُس کا پاس نہیں کرتا۔ وہ پاپی ہے۔ اور سخت پاپی ہے جسکا عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ وہ اپنی قومی ہستی کے خلاف ایک سخت پاپ کرتا ہے۔ اور ایسا سخت پاپ کرتا ہے جس کے کفارے میں آئندہ نسلیں شاید اسے گردن زدنی قرار دیں +

اب بہانے بنانے کا وقت نہیں

جے چند والئے قنوج اور پرتھی راج کی دشمنی کے واقعہ کا بیان اور یہ امر واقعہ بتا کر کہ جے چند کی صرف پرتھی راج سے دشمنی تھی۔ جسے پورا کرنے کے لئے اُس نے شہاب الدین غوری کو اپنی مدد کے لئے بُلایا۔

اگر ہمیں جے چند سے ذاتی خصومت نہیں۔ لیکن چونکہ اس کے ایک کام سے ہمیں بہ حیثیت ایک قوم کے نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے ہم سب جے چند کی بُرائی کرتے ہیں۔ اور اُسے گالیاں دیتے ہیں۔ اسی طرح ہم اِن لوگوں کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ جن کے کسی کام سے بہ حیثیت ایک قوم کے ہمیں فائدہ پہنچا ہے اس لئے آئندہ نسلیں اِن لوگوں کو بھی اسی ترازو پہ تولیں گی۔ جو کہ آجکل ملک اور قوم کے مجموعی فوائد کے خلاف یا اُن کے حق میں کام کر رہے ہیں۔ اس وقت ہم قومی حیثیت سے ایک ایسے مرحلے پر پہنچ گئے ہیں۔ جبکہ ہم میں سے ہر ایک اپنے لئے یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کے کسی فعل کا اس کے قوم اور ملک پر کیا اثر پڑیگا۔ یاد رکھو یہ وقت یہ اور یہ بہانے ڈھونڈھ کر اپنی آتما کو دھوکے دینے کا نہیں۔ اگر اس وقت ان بہانوں سے آپ کو کچھ دُنیاوی فائدہ پہنچ بھی گیا ہو تو وہ دن دُور نہیں جبکہ تمہاری آتما یہ بہانے ڈھونڈنے کے لئے تمہیں کاٹے گی۔ تمہاری سوسائٹی بھی تمہیں برداشت نہ کر سکے گی اور جو فائدہ کہ آج تمہیں نظر آرہا ہے وہی اُلٹا نقصان ہو کر تمہارے سامنے آئیگا۔

سرکاری ملازمتیں بھی چھوڑ دو

میں صرف بدیشی کپڑا چھوڑنے کے لئے ہی آپ سے نہیں کہتا۔ بلکہ ایک قدم اور آگے جا کر آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ آپ میں جو سرکاری ملازم ہیں وہ اُن ملازمتوں کو بھی چھوڑ دیں۔ اور اپنے خدمات سے گورنمنٹ کے ہاتھ مضبوط کر کے ہماری غلامی کی زنجیروں کو مضبوط نہ بنائیں ان کی خدمات کی اِن کی مادرِ وطن کو ضرورت ہے۔ اس لئے انہیں چاہیئے کہ اپنی بسر اوقات کا کوئی اور ذریعہ نکال کر اپنی تمام طاقتیں دلیش اور جاتی

کی خدمت کے لئے خرچ کر دیں۔ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ دیش اور وطن کے فرق سے پاپ اور پُن میں فرق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس وقت آپ کے ملک کی حالت ایسی ہے جبکہ بدیشی کپڑا استعمال کرنا اور سرکاری ملازمت میں رہنا تمہارے لئے پاپ ہے۔ آپ اپنے اندر یہ اثر پیدا کریں۔ کہ کوئی شخص بدیشی کپڑا پہن کر آپکے سامنے نہ آسکے۔

تمہارا سونا مشکل ہوجائیگا

اس وقت ہم اپنی قومی ترقی کے اُس مرحلہ پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ جب ہمیں معلوم ہونے لگا ہے۔ کہ فلاں فعل قوم کے لئے مضر ہے۔ ایسا وقت منطق چھانٹنے اور بہلانے بنانے کا نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ تمہیں اسوقت قومی حلقہ سے باہر رہ کر فائدہ پہنچے گا۔ لیکن وقت آئے گا۔ کہ تمہاری آتما اور تمہاری سوسائٹی تمہیں ستائے گی۔ اور تمہیں سونا بھی مشکل ہو جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ تمہارا موجودہ فائدہ بھی تمہارے لئے مضر ثابت ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے عزیز اپنے اندر اخلاقی طاقت پیدا کر کے ان گناہوں سے بچیں۔

پچھلے سال تمہارے دماغوں نے کئی قلابازیاں کھائیں۔ میں نے اپنی زندگی کے ۳۸ سال سکول اور کالج بنانے میں صرف کئے لیکن آج میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ میں نے پاپ کیا۔ اس طریقۂ تعلیم کے فائدہ سے اس کا زہر زیادہ مضر ہے اگر رام اور کرشن آج گول باغ میں سے گذریں۔ کہ جب وہاں ٹینس ہو رہا ہو۔ تو وہ یقیناً حیران ہو جائیں۔ کہ یہ ہندوستان ہے یا انگلستان۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم میں کوئی قومی نشان باقی نہیں رہا۔



لوکمانیہ تِلک اور مہاتما گاندھی

لوکمانیہ کی برسی کے موقعہ پر

لوکمانیہ کی وفات کو آج ایک سال گذر گیا۔ ان کی قوم نے جیسا ان کی مدت کو محسوس کیا۔ ویسا شاید ان کی زندگی کو کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ وہ ایک ایسے وقت میں مرے جبکہ ہندوستان ایک نئی زندگی کے آغاز میں تھا۔ ایک نیا ستارہ ہندوستان کے آسمان پر نمودار ہو کر آزادی کی لڑائی کو ایک نئے رُخ میں لے جا رہا تھا۔ لوکمانیہ کی فضیلت اور دیش بھگتی اس نئے ستارے سے کسی طرح کم نہ تھی۔ فضیلت میں دیش بھگتی کی گہرائی میں اور تجربہ میں لوکمانیہ مہاتما گاندھی سے بڑھ کر تھے کم نہ تھے۔ لیکن ایثارِ نفسی میں۔ دلیری میں۔ بے خوفی میں اور پولٹیکل اخلاق کے بارے میں جو اسٹینڈرڈ مہاتما گاندھی نے اپنے اہلِ مُلک کے سامنے پیش کیا اور جس نے دو سال کے قلیل عرصہ میں ان کو سارے ہندوستان کا ایک واحد اور مُستند لیڈر بنا دیا۔ وہ لوکمانیہ کے اسٹینڈرڈ (معیار) سے مختلف ہے۔ اسی خیال کو مدِ نظر رکھ کر میرے ایک نوجوان دوست نے جو اس وقت اپنی دیش بھگتی کے جرم میں کسی جیلخانہ میں چکی پیس رہے ہیں۔ لوکمانیہ کی وفات پر یہ کہدیا۔ کہ "اچھا ہوا لوکمانیہ جی مر گئے" مجھے اس کے اس ریمارک سے بڑا رنج ہوا۔ اور میں نے باتیں اس سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کہا؟ اس نے جواب دیا کہ ممکن ہے کہ بابا کی لوکمانیہ مہاتما گاندھی کی پولٹیکل فلاسفی کے ساتھ اتفاق نہ کر سکتے۔ اور اس

صورت میں ان دونوں لیڈروں میں کشمکش ہونے کے باعث قوم پرستوں کی دو پارٹیاں ہو کر ایک دوسرے کی کمزوری کا باعث ہوتیں۔ میں نے اس کو اس ریمارک کے لئے معافی نہ دی اور کہا کہ مجھے اس کے اس ریمارک سے بڑا دکھ ہوا۔ یہ نوجوان مہاتما گاندھی کے پولیٹیکل میدان میں آنے سے پہلے لوکمانیہ کا اندھ بھگت تھا۔ اور کسی وقت میں میرا بھی بھگت رہ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے جو کچھ کہا وہ نیک نیتی سے کہا۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے۔ کہ اس ریمارک میں کسی قدر سچائی بھی تھی۔ لیکن باوجود اس کے میں باور کرتا ہوں کہ یہ دیش کی بڑی بدقسمتی تھی۔ کہ لوکمانیہ ایسے وقت میں انتقال کر گئے۔ میں بھی اس وقت مہاتما گاندھی کا بھگت ہوں۔ لیکن میں شخصی حکومت کا معتقد نہیں۔ میرا یقین ہے کہ کوئی ایک شخص اس قدر عقلمند اور دانا نہیں ہو سکتا۔ کہ اسکی دانائی کو سارے دیش کے باقی سوچنے والوں کی دانائی سے بالاتر رکھ کر ایک بار اس کو مختار مطلق (ڈکٹیٹر) کی پدوی دی جائے۔ کبھی کبھی ایام جنگ یا انقلاب میں اس قسم کی ضرورت پڑتی ہے۔ کہ ایک آدمی کو اس قسم کے اختیارات دے دیئے جائیں۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے۔ کہ ایسے اوقات میں بھی یہ اختیارات ایک سے زاید آدمیوں کے ہاتھ میں ہوں تو بہتر ہے۔ میری رائے میں چھوٹی کمیٹیوں کی راہنمائی ہمیشہ ایک شخص واحد کی راہنمائی سے کم خطرناک ہوتی ہے۔

اس میں کچھ کلام نہیں۔ کہ لوکمانیہ کے پولیٹیکل اخلاق کا اسٹینڈرڈ مہاتما جی سے مختلف تھا۔ لوکمانیہ جی پولیٹیکل جدوجہد میں اس اونچے درجہ کی اہنسا کے قائل نہ تھے۔ جو مہاتما جی کی تعلیم و تلقین کا بنیادی پتھر ہے۔ ماہ ... انتے تھے کہ ڈپلومیسی کا مقابلہ ڈپلومیسی سے ہوتا ہے۔ جہاں ایک فریق دھوکے ... اور اہنسا پر تلا ہوا ہو۔ وہاں دوسرے فریق کے لئے اپنی سچائی اور کمانیہ ... اور

راست روی قائم رکھنا خود مصیبت کو سر پر لینا ہے۔ وُہ یہ سمجھتے تھے کہ یورپین چالبازی کا بہترین جواب چالبازی ہے۔ ان کی رائے میں جنگ کا اخلاق معمولی صلح کے زمانہ کے اخلاق سے مختلف ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی ایک با اثر سچائی کے قائل ہیں۔ اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جنگ میں بھی ہم کو اپنا اسٹینڈرڈ اخلاق کا نیچا نہیں کرنا چاہئے۔ علاوہ اِس کے مہاتما گاندھی اور لوکمانیہ میں ایک اور بھی اختلاف تھا۔ لوکمانیہ جی یہ مانتے تھے۔ کہ ہم کو ایک ہی ہتھیار پر بھروسہ نہیں رکھنا چاہئے۔ جیسے یوروپین قومیں اپنے جنگ وجدل میں مختلف قسم کے ہتھیار استعمال کرتی ہیں۔ جب ایک کارگر نہیں ہوتا تو دوسرا چلانے لگ جاتی ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی آزادی کے حصول کے لئے ایک ہی طریقے پر بھروسہ نہیں رکھنا چاہئے۔ مثلاً لوکمانیہ جی کونسلوں کے بائیکاٹ کے حق میں نہ تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قوم پرست کونسلوں پر قبضہ کرکے ان کو گورنمنٹ کو شکست دینے کے لئے استعمال کریں۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ کا ناک میں دم آجائے ایسے حالات میں ممکن تھا۔ کہ اس پایہ کے دو لیڈروں کے درمیان اختلاف رائے ہونے کی صورت میں جو یک جہتی قوم پرستوں میں اس وقت نظر آتی ہے۔ وُہ قائم نہ ہوتی۔ لیکن یہ بھی احاطۂ امکان سے باہر نہ تھا کہ بصورت حیات لوکمانیہ اور مہاتما گاندھی کے درمیان سمجھوتہ ہو جاتا۔ جس وقت لوکمانیہ جی مرے اُس وقت دیش ڈانواں ڈول تھا۔ اور لوگوں کو ابھی مہاتما گاندھی کی لیڈر شپ پر کافی بھروسہ پیدا نہ ہوُا تھا۔ اِس واسطے ان کی وفات کو قوم اور دیش نے نہایت محسوس کیا۔ میرے خیال میں ہندوستان کی تاریخ میں یہ دونوں باتیں بے نظیر ہیں۔ یعنی لوکمانیہ تلک کی وفات پر عالمگیر رنج۔ اور مہاتما گاندھی کی لیڈرشپ میں عالمگیر بھروسہ +

لوکمانیہ تلک کی زندگی کا سب سے زبردست پہلوان کی انتہیہ دیش بھگتی تھی مہاتما گاندھی کی زندگی کا سب سے زبردست پہلوان کی سچائی اور اُن کی بے خوفی ہے۔ لوکمانیہ نے لوگوں کو اپنے دیش کے لئے تکلیف اُٹھانی اور عذاب سہنے سکھائے۔ مہاتماجی نے اپنے ہموطنوں کے دلوں میں سے خوف کو نکال دیا۔ اور تمام خفیہ تحریکوں کا ناش کر دیا۔ لوکمانیہ نے اپنی ساری فضیلت یہ ثابت کرنے میں خرچ کیا۔ کہ کرم یوگ میں کامیابی کا اوچیہ معیار دیش بھگتی ہے۔ مہاتماجی نے اپنی زندگی کا اُونچا معیار سچائی کو قرار دیا۔ مہاتماجی قول و فعل میں زندگی کے ہر ایک پہلو میں سچائی کا پرچار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دیش بھگتی اور قوم پرستی بھی راست بازی اور راست روی کے ماتحت ہے لوکمانیہ کرشن مہاراج کی اس حرکت کو نہایت جائز اور قابل تقلید سمجھتے تھے۔ جہاں انہوں نے مہابھارت کی جنگ میں اپنے مخالفین پر فتح پانے کے لئے یودھشٹر کو ایسے ذومعنی فقرے کہنے پر مجبور کیا۔ جس سے ان کے مخالفین کے دل میں غلط خیال پیدا ہوا۔ کرشن مہاراج کا یہ فعل ڈپلومیسی کی حد تک پہنچتا تھا۔ گاندھی جی اپنے اخلاق کا اسٹینڈرڈ ایام جنگ میں بھی نرمل (یعنی خالص اور پاکیزہ) رکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ گاندھی جی کا طریقہ ہندو دماغ کو زیادہ بھاتا ہے۔ اور اس نے ہندو دل و دماغ کو تسخیر کر لیا ہے۔ اور ہندوستان کی موجودہ اخلاقی اوستھا میں میری رائے میں وہ زیادہ موزون اور قابل قدر ہے۔ قبل اس کے کہ ہندوستانی اپنی زندگی کو ایسا اُونچا بنا سکیں۔ کہ وہ دیش کیجا طرا اپنی خدمات کو بالکل نشکام (یعنی بے غرض) کر سکیں۔ ان کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ سچائی کے اس اُونچے مینار پر چڑھ جائیں۔ جہاں گاندھی جی

ان کو لیجانا چاہتے ہیں جو لوگ پبلک لائف میں تھوڑا سا مکر و فریب اور ڈپلومیسی جائز
سمجھتے ہیں۔ وہ اکثر اوقات پرائیویٹ لائف میں بھی اس کو جائز ٹھہرانے لگتے ہیں
جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پبلک لائف کو اپنی ذاتی ترقی و ذاتی بہبودی کا ایک
ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ غلام قوموں کو سب سے پہلی اور سب سے بڑی ضرورت یہ ہوتی
ہے۔ کہ ان کی پبلک لائف اخلاق اور ایثار نفسی اور قربانی کے اونچے سٹینڈرڈ پر
پہنچ جائے۔ اور ان میں سے خود غرضی اور مکاری کے بیج نشٹ ہو جائیں۔ آزاد
قوموں کے لیڈر اپنی ڈپلومیسی کو ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنے سے پرہیز
کر سکتے ہیں۔ مگر غلام لیڈروں کے راستہ میں ہمیشہ یہ ترغیب رہتی ہے کہ وہ پبلک
لائف میں ڈپلومیسی کے عادی ہو کر اس کو اپنے پرائیویٹ اغراض کے لئے استعمال
کریں۔ چنانچہ اس وقت اس کسوٹی پر بہت سے ہندوستانی قوم پرست کھوٹے
ثابت ہوئے۔ غلام قوموں میں آزادی کی کش مکش کیرکٹر پر مبنی ہونی چاہئے۔ ورنہ ان
میں کامیابی کی اُمید موہوم ہو جاتی ہے۔ فاتح اقوام کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ جھوٹے
وعدوں سے اور ذاتی ترقی و ذاتی بہبودی کے زبردست لوبھنوں سے Temp
taion سے قوم پرستوں کے دلوں کو ڈانواں ڈول کرتے رہتے ہیں اور ان میں سے
بہتوں کو جن کا کیرکٹر ایثار نفسی اور سچائی اور بے غرضی کے چٹانوں پر کھڑا نہ ہو سکے۔
بڑے بڑے عہدوں خطابوں و جاگیروں سے خرید لیتے ہیں۔ قوم پرست یہ سمجھتے
ہیں کہ وہ فاتح قوم کو اپنی قومی آزادی کے لئے استعمال کر سکیں گے۔ اور نیز اپنا ذاتی
فائدہ بھی کریں گے۔ حالانکہ نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ فاتح قوم ان کو اپنے فائدہ
کے لئے استعمال کرتی ہے۔ اور ان کے کیرکٹر کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کو
اپنے ہی دیش اور اپنے ہی قوم کے برخلاف استعمال کرتی ہے۔ ایسی صورت
میری رائے میں آزادی کی لڑائی کو کامیابی سے لڑنے کے لئے ضروری ہے کہ

کے سپاہی باڑی راست روی - ایثار نفسی اور بے غرضی کی مضبوط چٹان پر
کھڑے رہیں - ان کا کیرکٹر ایسا مضبوط ہو جائے کہ وہ کبھی کسی صورت میں بھی نہ ڈگمگا
سکے - وہ اپنے راستہ پر سے کبھی نہ ہٹ سکیں - کیرکٹر کی یہ مضبوطی مہاتما گاندھی کے
اصولوں سے زیادہ یقینی طور پر حاصل ہو سکتی ہے - تاہم ملک و قوم کے لئے یہ ضروری
ہے - کہ ہمارے درمیان اس قسم کے مہان آتما لیڈر موجود ہوں - جو مہاتما گاندھی کو
بھی حسب ضرورت کہہ سکیں کہ وہ غلط راستہ پر جا رہے ہیں - لوکمانیہ تلک کی وفات
سے ہندوستان کا ایک شردھنی لیڈر جس میں یہ وصف بدرجہ کمال موجود تھا - جاتا
رہا - اور اسی لئے ان کی وفات کو قوم نے بہت زیادہ محسوس کیا - آج ان کی برسی پر
ہم اپنی شردھا اور بھگتی کے پھول لوکمانیہ کی آتما کے سامنے بھینٹ کرتے ہیں اور
پرماتما سے دعا کرتے ہیں کہ وہ دیش میں لوکمانیہ کی اننیہ دیش بھگتی کی سپرٹ کو
ترقی دیں - لوکمانیہ کی دیش بھگتی ہمارے دل کے تخت پر براجمان رہے - اور
ہم ہمیشہ اس سے مضبوطی اور زندگی حاصل کرتے رہیں ؞



لوکمانیہ تلک کی برسی ۱۹۲۱ء

یکم اگست کو لوکمانیہ تلک کی برسی ہے۔ پونا میں ۳۰ جولائی کو بموجب ہندی تاریخ کے یہ برسی منائی گئی۔ مہاتما گاندھی نے ان کی تصویر کو بے نقاب کیا۔ اور یادگار میں ایک بڑا پبلک جلسہ ہوا جس میں تلک مہاراج کی زندگی پر تقریریں کی گئیں۔ تلک مہاراج کی زندگی کا سبق کیا ہے؟

میری رائے میں ان کے جیون کا سبق دیش کی انّنیہ ([illegible]) (لاشرک عقیدت) بھگتی ہے۔ تلک مہاراج نے کبھی اپنی زندگی میں اس اُدیش کو پس پشت نہیں ڈالا۔ جو کام کیا خواہ پبلک خواہ پرائیویٹ۔ اس میں دیش کو پردھان پد دیا۔ اپنے اس اُدیش کی خاطر طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں۔ مگر کبھی ایک منٹ کے لئے بھی اپنے دل کو ڈانوا ڈول نہیں ہونے دیا۔ ان کے لئے دیش کی سیوا کرنا ہی مہان دھرم تھا۔ اسی کا وہ پرچار کرتے رہے اور اسی کے واسطے کام کرتے رہے۔ ان کا گرہست بھی اسی اُدیش کے ماتحت تھا۔ انہوں نے جیون بھر تپسیا کی ہمارے ملک میں اور بھی دیش بھگت ہیں جنہوں نے بہت بیش قیمت خدمتیں اپنے ملک کی اور اپنی جاتی کی کیں۔ لیکن ایسے شاید نصف درجن آدمی بھی پچھلی صدی میں نہیں ہوئے۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا یہی مہان اُدیش بنایا ہو۔ شاید نصف درجن کہنے میں بھی مبالغہ کرتا ہوں۔ ایسے آدمی نصف درجن سے بہت زیادہ

ہوئے ہیں جنہوں نے دیش سیوا کو اپنی زندگی کا لکش بنایا۔ لیکن ایسے آدمی نصف درجن بھی نہیں ہوئے جنہوں نے دیش کی پولٹیکل آزادی کو اپنی زندگی کا ایک مانر لکھش بنایا۔ لوکمانیہ کا دھرم اور کرم یہ سب اسی لکھش کے ادھین تھے۔ اور اسی لئے ہم ان کو دیش کے پولٹیکل لیڈروں میں اُونچ پدوی دیتے ہیں آج دیش میں بہت سے آدمی کمال ایثار نفسی اور تن دہی سے دیش کی پولٹیکل آزادی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ نوجوانوں کا ایک معقول گروہ بھی اسی اُدیش کو لے کر کمال درجے کی بھگتی اور قربانی کا ثبوت دے رہا ہے۔ لیکن جس لوکمانیہ تلک نے اپنی آواز کو دیش کی پولٹیکل آزادی کے حق میں بلند کیا۔ اس وقت ملک میں شاید ایک دو آدمی ہی ایسے ہونگے جنہوں نے بیخوف ہوکر اور ہر قسم کی جوکھوں اٹھا کر آزادی کا جھنڈا بلند کیا۔ اور جیلخانے تک جانے کی پرواہ نہ کی۔ لوکمانیہ کی ہر دلعزیزی کا یہی راز تھا اور اسی سبب سے آج وہ تیس کروڑ ہندوستانیوں کے پوجیہ پتر سمجھے جاتے ہیں ہندوستان کی تاریخ میں اور کوئی ایسی مثال یاد نہیں پڑتی جس موقعہ پر کسی ایک منشیہ کے مرنے پر تمام عظیم ہندوستان کی مختلف آبادیوں نے اس قدر رنج و غم کیا ہو۔ اس درد اور محبت بھرے ہوئے جذبے سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں تلک مہاراج کی جتنی یادگاریں قائم کی گئی ہیں۔ وہ بھی اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ اس وقت بھی ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی ذات ہے جسکے لئے ہندوستانیوں کے دل میں لوکمانیہ تلک جیسی محبت اور بھگتی ہے۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ مہاتما گاندھی کی خدمات پولٹیکل میدان میں ابھی تک اس قدر بیش قیمت ثابت نہیں ہوئیں۔ جسقدر لوکمانیہ تلک کی تھیں اس وقت مہاتما گاندھی دیش کے ایک مانر پوجیہ لیڈر ہیں۔ لیکن ان کی

موجودہ کامیابی ان بنیادوں پر کھڑی ہے۔ جو لوکمانیہ تلک نے قائم کیں۔
پولٹیکل کام میں یہ اصول نہایت قیمتی ہے۔ کہ ہم نوکر شاہی کی پسندیدگی
یا عدم پسندیدگی کا خیال نہ کریں۔ جو لوگ اس کا خیال کرتے ہیں۔ انکی دیش
بھگتی انتیہ نہیں ہوسکتی۔ اور اس میں وِش یعنی زہر ملا ہوا رہتا ہے۔ ہم کو
افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ انڈین نیشنل کانگرس کے بہت سے سابقہ
لیڈروں کی زندگی اس اصول پر کاربند نہیں رہی۔ وہ اپنے کام میں ہمیشہ
یہ سوچتے رہے کہ ایسا نہ ہو۔ گورمنٹ اور انگریز ناراض ہو جائیں۔ لوکمانیہ
تلک نے یہ کبھی خیال نہیں کیا اور نہ مہاتما گاندھی کبھی اس خیال سے مؤثر
ہوئے۔ یہی باعث ہے کہ پولٹیکل میدان میں ان دونوں بزرگوں کا کام زیادہ
پھلدایک اور مقبولِ عام ہوا۔ اور ہندوستان کو پوری آزادی کبھی معقول
عرصے میں حاصل ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہوسکتی۔ اگر اس اصول کو مدنظر
نہ رکھا جائے۔

یہ اصولی فرق ہے لوکمانیہ تلک اور مہاتما گاندھی کے کام میں اور ہمارے
ماڈریٹ بھائیوں کے کام میں پولٹیکل کام کا ایک یہ راز ہے۔ کہ قوم کو اصولی تعلیم
درست ملنی چاہیئے۔ کوئی مفتوح قوم اصولاً کسی فاتح قوم پر اپنی آزادی کیلئے
بھروسہ نہیں کرسکتی۔ اور یہ امر پولٹیکل نادانی پر دلالت کرتا ہے۔ کہ آزادی
چاہنے والے لیڈر قابض گورمنٹ پر بھروسہ و اعتبار کر کے آزادی حاصل
کرنے کی کوشش کریں۔ جب تک آزادی کے خواہشمند آزادی کی آزاد لڑائی
نہیں لڑتے۔ تب تک وہ دھوکے میں رہتے ہیں۔ ممکن ہے ان کو اپنے بعض
مقاصد میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ مگر آزادی کبھی نہیں مل سکتی۔ میرا ہرگز
یہ منشا نہیں ہے کہ آزادی کی لڑائی میں ہم غیر گورمنٹ کے برخلاف بھی جھوٹ

اور بے انصافی کا سہارا لیں۔ لیکن میری رائے میں جو لوگ یہ اُمید کرتے ہیں کہ کوئی فاتح قوم اپنی مفتوحات بالکل رضامندی سے باآسانی سے چھوڑ دے گی۔ وُہ انسانی نیچر کو بھُلا دیتے ہیں۔ اس وقت بھی اینگلو انڈین حکام کا رویہ اور طریقہ ہمارے اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ہر ایک ضلع میں اینگلو انڈین حکام ناجائز کوششوں سے آزادی کی تحریک کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لڑائی میں بڑے بڑے اعلےٰ حکام نے انصاف اور سچائی کے اصُولوں کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ وہ ایسے لوگوں سے دوستی گانٹھ رہے ہیں۔ جن کو وُہ جھُوٹا اور بے ایمان جانتے ہیں۔ جو ہر ایک طریقے سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جہاں عدم تعاونی مہاتما گاندھی کی زیرِ سرداری سچائی پر تُلے ہوئے ہیں۔ وہاں ان کے مخالف صرف مصلحت وقت کو اپنا مذہب سمجھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو ہندوستانی اس وقت گورنمنٹ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وُہ غلط اصُول پر چل رہے ہیں +

میں چاہتا ہوں لوکمانیہ تلک کی برسی کے دِن سارا دیش اِسی اصول کو اپنی زندگی میں دھارن کرے۔ تاکہ ہمارے پولٹیکل کام میں دیری خواہ ہو جائے مگر غلطی نہ ہو +



بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ

سودیشی کپڑے کے پرچار میں میں نے شاید ہندوستان بھر میں سب سے پہلے قدم اُٹھایا تھا۔ یہاں پر یہ تحریک آریہ سماج کے ساتھ شروع ہوئی تھی اور کچھ مُدت تک اپنے زوروں پر رہی۔ چنانچہ لودھیانہ کلاتھ۔ گجرات کلاتھ وغیرہ کو اسی تحریک کے ساتھ فروغ ہوا تھا۔ تعلیم یافتہ جماعت کے زبردست حصہ نے اپنی زندگی کے مختلف حِصص میں سودیشی کپڑا پہننے کے اقرار کئے۔ مگر اس تحریک میں دو قسم کی کمزوری تھی۔ ایک تو اس کے پرچارک نیم دل تھے۔ وہ اپنے پرتگیا پتروں میں یتھا شکتی "یعنی جہاں تک ممکن ہو سکے" درج کر دیتے تھے۔ اور اس سے اُن کو کئی قسم کے بہانے انگریزی کپڑا پہننے کے مِلجاتے تھے۔ مثلاً مجھ کو یاد ہے۔ کہ اِس تحریک کے پیر پیغمبر انگریزی ململ کے صافے اور دوپٹے اپنی صحت کے لئے ضروری سمجھتے رہے۔ دُوسرے اُنھوں نے انگریزی سوت کا بائیکاٹ نہیں کیا۔ اُن کو صفائی اور باریکی کا مرض لگا ہوُا تھا۔ اور اُنھوں نے سودیشی کپڑے کے پرچار کے ساتھ ساتھ ایک گونہ سودیشی سُوت کا صفایا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوُا کہ چرخہ کا استعمال ہمارے گھروں سے بالکل نیست و نابود ہو گیا۔ اور انگریزی سوت کے کپڑے کا رواج پنجاب میں خاصہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانی مِلّوں میں سوت بننا شروع ہوُا۔ اور انگریزی سُوت کی بجائے قدرے ہندوستانی مِلّوں کا سوت اِستعمال ہونے لگا۔

اس تحریک کی دُوسری منزل وُہ تھی جبکہ بنگال نے سودیشی کی آواز اٹھائی اور تقسیم بنگال کو منسُوخ کرانے کے لئے بدیشی کا بائیکاٹ اور سودیشی کا پرچار شروع کیا اس وقت دیش میں سودیشی کا زبردست پرچار ہوا اور بنگال نے ایک سال کے لئے لنکا شائر کے مال کو زبردست نقصان پہنچایا۔ ہمارے ماڈریٹ بھائی اسوقت بھی بائیکاٹ کے خلاف تھے۔ ان کے نرم دل اس امر کو گوارا نہ کرسکتے تھے کہ بائیکاٹ کا زبردست استعمال پولیٹیکل یا ایسا تمک اغراض کے لئے استعمال کیا جاوے اُن کی رائے میں بائیکاٹ میں نفرت کا عنصر موجود ہے اور وُہ ایسے دیوتا سرُدپ ہیں کہ نفرت پھیلانا وُہ اپنے دھرم سے درُود نیچے سمجھتے تھے۔ بنارس کانگرس ۱۹۰۵ء میں کلکتہ کی کانگرس ۱۹۰۶ء میں اس معاملہ میں زبردست بحث رہی مرحوم مسٹر گوکھلے نے اس امر کو تو مان لیا کہ بنگال کو یہ حق ہے۔ کہ تقسیم بنگال کی منسُوخی کے لئے بائیکاٹ کو بطور عارضی اوزار کے استعمال کرے۔ مگر اُنہوں نے اُس کو بطور اصول کے تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء کی پھُوٹ کی تہ میں منجملہ دیگر خیالات کے ایک خیال یہ بھی تھا۔

مہاتما گاندھی بھی بُہت دنوں تک اس وہم کے شکار بنے رہے۔ اصل میں مفتوحہ قوموں کے لئے جو اپنے جنگ آزادی میں ہتھیاروں کا استعمال نہیں کرنا چاہتے یا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے بائیکاٹ ہی زبردست ہتھیار ہے۔ اگر بدیشی راج سے نفرت کرنا ہی ہے تو بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں بھی نفرت کا خیال ناجائز نہ ہونا چاہئے۔ مگر میری رائے میں اِن دونوں خیالوں میں نفرت کا بہت کم عنصر ہے۔ اس میں زیادہ تر عنصر حفاظت خود اختیاری کا ہے۔ ہم ہندوستان میں سودیشی راج قائم نہیں کرسکتے۔ جب تک بدیشی راج کے برخلاف یُدھ نہ کریں اسی طرح ہم سودیشی کپڑے کا کافی پرچار نہیں کرسکتے۔ جبتک بدیشی کپڑے کا

بائیکاٹ نہ کریں۔ میری رائے میں بائیکاٹ کے لفظ سے اجتناب ایک قسم کی کمزوردلی پر مبنی ہے۔ کوئی قوم ترقی کے صحیح راستہ پر نہیں پڑ سکتی جب تک واقعات کے ناقابلِ تردید منطق کی پیروی کرنا نہ سیکھے۔ کسی مفتوح قوم کے لئے اس قسم کی نرم دلی زہر قاتل کی مانند ہے۔ ویدوں میں پرماتما کو "ردر روپ" بیان کیا گیا ہے۔ اور اس سے "منو" کے دان کی پرارتھنا کی گئی ہے "منیو" کے معنے انگریزی شبدوں میں (Aughtangeen.) یعنی جائز خفگی ہے۔ جس شخص میں یہ شکتی نہیں ہے۔ کہ وہ ظلم وستم۔ ادھرم و اتیاچار۔ غلامی و اسیری سے جائز طور پر نفرت کر سکے وہ آزادی سے پریم نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے آزادی کی لڑائی لڑنا ناممکن ہے۔ قدم قدم پر اسکے ہاتھوں میں رعشہ اور اس کے پیروں میں لرزا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ گھبراتا اور کانپتا ہے وہ کبھی بے خوف اور نڈر ہو کر آزادی کی لڑائی نہیں لڑ سکتا۔ میں اس اصول کو مانتا ہوں۔ کہ ہم کو انسانوں سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ اور ہر ایک انسان سے خواہ وہ کیسا ہی پاپی اور ظالم کیوں نہ ہو پریتی اور پریم کا بھاؤ برتنا چاہئے مگر ظالم و پاپی کے ظلم و پاپ سے نفرت کرنا ہی ظالم اور پاپی کے ساتھ پریم کرنا ہے۔ بدیشی راج خواہ دھرماتما اور منصف مزاج انسانوں کے ہاتھ میں ہو۔ بدیشی راج خواہ بعض پہلوؤں میں سودیشی راج سے بھی اچھا ہو سکیں۔ وہ دراصل انیائے۔ یعنی بے انصافی پر مبنی ہے اور اسو بھاوک یعنی (unnatural.) ہے۔ جس قوم کو بدیشی راج کے ساتھ پریم ہو جاوے سمجھنا چاہئے۔ کہ اس کے اندر سے انسانیت و آزادی کے بھاؤ نشٹ ہو گئے۔ اور وہ کبھی مردوں کی قوم نہیں کہلا سکتی ✢

کوئی مفتوح یا غلام قوم آزاد نہیں ہو سکتی جو بدیشی راج سے اسقدر نفرت

کرنا نہ سیکھے۔ جسقدر کہ اُس کو اپنی آزادی کے لئے ضروری ہو۔ یہ نفرت ہم کو سسٹم سے ہے نہ کہ انسانوں سے اور قوموں سے۔ ہمکو انگریزوں سے یا دیگر بدیشیوں سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ ہم کو انگریزی قوم کے ساتھ ودیش بھاو کو اپنے اندر جگہ نہ دینی چاہیئے۔ مگر ہم آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ جبتک ہمارے دلوں میں یہ خیال مضبوطی سے گڑ نہ جاوے۔ کہ ہماری انسانیت و مردانگی قوم پرستی و حُبّ الوطنی کا ابتدائی تقاضا یہ ہے۔ کہ ہمارے مُلک میں بدیشی راج کی بجائے سودیشی راج ہو۔ اس لئے جو لوگ یہ خیال ظاہر کرتے رہے ہیں۔ کہ ہم بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کے بغیر سودیشی کپڑے کا پرچار کامیابی سے کرتے رہے ہیں۔ وہ ایک غلط خیال کے شکار رہے ہیں۔ میری بُدھی نے سودیشی اور بائیکاٹ میں کبھی بھید نہیں کیا۔ ۱۹۰۶ء میں جب لارڈ منٹو نے کلکتہ کانگرس کی نمائش کھولتے ہوئے "سچی سودیشی" کو بائیکاٹ سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس وقت بھی میں نے اپنا خیال دلیری سے ظاہر کیا تھا۔ اسی طرح میں اور میرے ہمخیال یہ یقین کرتے رہے ہیں۔ کہ ہمارے اندر سودیشی راج کی محبّت اور ضرورت قائم نہیں ہو سکتی جب تک ہم بدیشی راج کو جہاں تک ممکن ہو سکے۔ بائیکاٹ نہ کریں جس طرح سے اس وقت میں ہمارے لئے تمام بدیشی اشیاء کا بائیکاٹ ناممکن ہے۔ اسی طرح ہمارے واسطے بدیشی راج کا مکمل بائیکاٹ ناممکن ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس قدر ہم بدیشی راج کا بائیکاٹ کرنے میں کامیاب ہونگے اُسی حد تک ہم سودیشی راج کی بُنیادوں کو قائم کرنے میں کامیاب ہونگے۔ نان کوآپریشن یا ترکِ موالات یا عدم تعاون اسی اصُول پر مبنی ہے۔ صرف الفاظ مختلف ہیں اسی اصول پر مہاتما گاندھی یہ تعلیم دیتے ہیں۔ کہ عدالتوں و سکولوں و کالجوں کا بائیکاٹ کیا جاوے۔ اور انگریزی گورنمنٹ کے دیئے ہوئے خطابات و

اعزازات کو ترک کیا جاوے۔ اور انگریزوں کی نوکری سے پرہیز کیا جاوے اسی اصول پر اب اُنہوں نے بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ شروع کیا ہے۔ بنگالیوں کے بائیکاٹ میں اور مہاتما گاندھی کے بائیکاٹ میں یہ فرق ہے۔ کہ بنگالیوں نے صرف انگریزی کپڑے کا بائیکاٹ کیا تھا۔ مگر مہاتما گاندھی کا بائیکاٹ بدیشی کپڑے پر حاوی ہے۔ بنگالیوں نے ساری انگریزی ساخت کی چیزوں کا بائیکاٹ مشتہر کیا تھا۔ مہاتما جی اس وقت زیادہ تر بدیشی کپڑے پر زور دے رہے ہیں۔ اِس سے پہلے جو سودیشی کا پرچار رہا۔ اور مہاتما گاندھی جو سودیشی کا پرچار کر رہے ہیں۔ اسمیں اور پہلے میں اصولی بھید ہیں اب تک جو سودیشی کا پرچار ہوا اُس میں اس امر کی پرواہ نہیں کی گئی تھی۔ کہ مال جس سے چیزیں بنائی جاتی ہیں بدیشی تھا یا سودیشی مثلاً ہر ایک قسم کے بدیشی سوت کا بُنا ہوا کپڑا سودیشی سمجھا جاتا تھا۔ بشرطیکہ وہ ہندوستان میں بُنا گیا ہو۔ مثلاً جاپان و انگلینڈ و جرمنی سے جو سوت یا ریشم آتا تھا۔ اُس سے اِس دیش میں بُنا ہؤا کپڑا سودیشی سمجھا جاتا تھا۔ مہاتما جی نے اب یہ صاف کر دیا۔ کہ سودیشی کپڑا صرف وہ ہے جو دیسی سوت کا اور دیسی بناوٹ کا ہو +

دوئم اُنہوں نے سودیشی کی تین قسمیں قرار دیں۔ ایک وُہ سودیشی جو ہاتھ سے کاتے ہوئے سوت کا اور ہاتھ سے بُنا ہؤا ہو۔ یعنی مِل کا نہ سُوت ہو نہ مِل کا بنایا ہؤا ہو دُوسری وہ جو ہندوستانی مِلّوں کے سُوت کا مگر ہاتھ سے بنایا ہؤا ہو۔ سوئم وہ جو ہندوستانی مِلّوں کے سُوت سے ہندوستانی مِلّوں کا بنایا ہؤا ہو۔ گویا بدیشی سوت یا ریشم کا کپڑا سودیشی نہیں ہو سکتا۔ خواہ وُہ بنا ہؤا ہندوستان کا ہی کیوں نہ ہو یہ تمیز اصولی ہے۔ اُن کے نزدیک ایک شدھ سودیشی کپڑا صرف وُہ ہے جو ہاتھ کے کتے ہوئے سُوت کا۔ ہاتھ سے بُنا ہؤا ہو +

ایک محبّ الوطن چینی استری

کچھ عرصہ ہؤا۔ مجھے ایک ہندوستانی استری کی مہربانی کی وجہ سے ایک چینی استری سے مُلاقات کرنیکا موقعہ مِلا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے ایک چینی استری سے مِلنے کا اتفاق ہؤا یہ لنڈن کے ایک کالج میں ایک وِدیارتھنی ہے۔ اور اُس کی بات چیت سے یہ ظاہر ہؤا۔ کہ وُہ اپنے مُلک پر دل و جان سے مٹی ہوئی ہیں۔ اس کے خیالات ایسے دلچسپ تھے۔ اور بعض باتوں میں ایسے حوصلہ افزا تھے۔ کہ میرا خیال ہے کہ انکا پرچار ہندوستان بھر میں ہونا چاہیئے۔ اور مجھے پُورا بھروسہ ہے۔ کہ یہ خیالات ہندوستان بھر میں بڑی دلچسپی سے پڑھے اور سُنے جائیں گے ✣

پہلا سوال۔ جو مَیں نے اُس سے کیا وُہ یہ تھا۔ کہ اُس کا اِس مُلک میں آنے کا کیا مقصد ہے۔ اُس نے فوراً جواب دیا "تعلیم" پھر مَیں نے دُوسرا سوال پُوچھا "تعلیم کِس غرض سے"؟ ✣

جواب "اپنے مُلک کی سیوا کرنے کے لئے" ✣

اُس نے یہ بات میرے ذہن نشین کردی کہ اُس کا یہ ارادہ ہے۔ کہ اپنی ماترِی بھُومی کی خدمت میں اپنی زندگی گذار دے۔ کیونکہ اُس نے کہاکہ "میری ماترِی بھُومی خاص مُشکلات میں مُبتلا ہے۔ اور میرے مُلک

کے ہر لڑکے اور لڑکی کا مجموعی طور پر یہ فرض ہے۔ کہ ماتری بھومی کی آزادی اور عزت کو قائم رکھنے کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دے۔ ہمارے ملک میں غداروں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن وہ آدمی انگلی پر گنے جا سکتے ہیں جو اپنے ملک کی محبت سے سرشار ہوں۔ میں اپنے ملک کی عورتوں کے لئے کام کرنے کے واسطے پیدا کی گئی ہوں۔ اس لئے میرا یہ ارادہ ہے۔ کہ میں اپنی زندگی اُن کی سیوا کے نذر کروں "

جب میں نے اس چینی لیڈی کے مذہب کے متعلق سوال کیا۔ تو اُس وقت مجھ کو اُس کی حب الوطنی کا پورا پورا حال معلوم ہو گیا۔ اُسکا مذہب عیسائی ہے۔ مگر اُس کے والدین بدھ مذہب کے پیرو ہیں۔ حالانکہ وہ عیسائی بن گئی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے والدین اس کے نان نفقہ کے کفیل ہیں اور اس کی تعلیم کا بار بھی اپنے ذمہ لیا ہوا ہے +

پھر میں نے سوال کیا کہ "آپ نے اپنا مذہب کیوں چھوڑ دیا" جواب میں اُس نے تین سبب بتلائے (اوّل) وہ یہ چاہتی ہے۔ کہ چینی عیسائی عورتیں چینی قومیت کی طرف رجوع ہوں۔ اس کی یہ رائے ہے۔ کہ چینی عیسائی لوگ حب الوطنی کے خیال سے مُعرّا ہیں۔ اور یہ بات اشد ضروری ہے کہ اُنکے درمیان چند ایسے پُرجوش قوم کے دلدادہ کام کریں۔ جو اُن کو سیدھے ڈگر پر لانے میں کامیاب ہو سکیں +

اس جواب کا ماحصل یہ تھا۔ کہ عیسائیت نے اُن لوگوں کو قومی خیالات سے کورا بنا دیا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ بعض ایسی عورتیں جو اپنے ملک کی فدائی ہوں ان لوگوں میں کام کریں (دوسرا) سبب بھی اِسی قسم کا ہی تھا۔ لیکن ذرا وسیع تھا۔ اسکا یہ خیال ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے

جب عیسائی قوم چین میں ترقی کرے گی۔ اور اس وقت یہ بات پسندیدہ معلوم ہو گی۔ کہ چین کے عیسائی شدہ لوگ قوم پرست بھی بنے رہیں +

میں نے کہا یہ دونوں سبب دنیوی نکتۂ خیال سے بتلائے گئے ہیں اور ایک معنی میں ہیں بھی۔ دراصل بہت بلند اُس نے کہا۔ لیکن میں یہ چاہتی تھی۔ کہ کوئی مذہب اختیار کر لوں۔ کیونکہ میرے خیال میں اخلاق کو اس وقت تک خطرہ رہتا ہے۔ جب تک کسی قسم کا مذہب بھی اسکی پشت و پناہ کے لئے نہ ہو۔ اور چونکہ جس قسم کا مذہب میرے مُلک میں پھیلا ہُوا ہے مجھ کو طمانیت نہیں بخش سکتا تھا۔ اِس لئے میں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا +

پھر میں نے اُس سے دریافت کیا " کیا آپ نے اپنے مذہب کا بھی مطالعہ کیا +

جواب ملا " ہمارا تو مذہب ہی کوئی نہیں ہے۔ کنفوشیس کی تعلیم صرف عام اخلاق کے بارے میں ہے " میں نے پوچھا " اور بُدھ مذہب کی تعلیم؟ اُس نے کہا " اوہ میرے لئے یہ مذہب بڑا ہی سخت مشکل گورکھ دھندا ہے "

میں نے کہا آپ کی نگاہ میں عیسائی مذہب کے چوٹی کے اوصاف کیا ہیں " اس کا جواب ملا " امید " میں نے پھر پوچھا۔ کہ کیا چین کا اصل مذہب " اُمید " سے بالکل خالی ہے ؟ "

جواب۔ میرے مُلک کی رائج الوقت رسُومات انسان کو نہایت ہی اشانت بنا دیتے ہیں۔ اور اس کے لئے کسی طرف کوئی اُمید باقی نہیں چھوڑتے۔ بُدھ مذہب بھی بگڑ کر بُت پرستی اور منتر جنتر بن گیا ہے +

میں نے سوال کیا " آپکو عیسائیت کی طرف کس نے رجوع کیا تھا "+

جواب ملا " میں ایک مشن سکول میں پڑھا کرتی تھی "

دوسرا سوال۔ کیا بائیبل کی تعلیم پر آپ کا اٹل وشواس ہے۔ اور عیسی

کی ماتا کے کنوارے ہونے پر یقین ہے ؟

جواب ملا "میرا یہ اعتقاد نہیں - کہ بائیبل کا ہر لفظ الہامی ہے - نہ میں یہ خیال کرتی ہوں - کہ عیسیٰ کو خدا کا بیٹا قرار دینے کے لئے حضرت مریم کے کنوارے پن میں بھی وشواس رکھنے کی ضرورت ہے - ہر شخص خدا کا بیٹا ہو سکتا ہے"

میں نے کہا - آپ کٹر عیسائی نہیں ہیں - اور جس قسم کی عیسائی تم ہو - اس طرح کا تو ہر شخص مذہب تبدیل کئے بغیر ہو سکتا ہے *

اب میں نے اس سے چین کی عورتوں کے متعلق سوال کئے - جواب میں اسنے کہا - کہ چین میں پردے کا رواج نہیں - لیکن وہاں انگلستان جیسی آزادی بھی نہیں ہے - مثلاً اس نے کہا - کہ چین میں یہ بات شاذ و نادر دیکھی جائے گی - کہ ایک چینی لڑکی اجنبی سے اپنے رشتہ داروں کے ہوتے ہوئے بھی بات چیت کر سکے - لڑکیاں عموماً بیس برس میں بیاہی جاتی ہیں - اور اچھے خاندان کے لوگوں میں خاوند بیوی کی نسبت ایک یا دو برس بڑا ہوتا ہے - ورنہ عام طور پر پتی اور پتنی کی عمریں مساوی ہوتی ہیں"

میں نے پوچھا - کیا چینی لڑکیوں میں تعلیم کا عام رواج ہے - اس نے کہا وہ خط پتر لکھنے کے لئے ہی پڑھتی ہیں - لیکن اب اعلےٰ درجہ کی تعلیم کا رواج بھی ہو رہا ہے - اور ان میں سے بہت سی سیکنڈری تعلیم حاصل کر رہی ہیں *

پھر مجھے بتلایا گیا - کہ چین میں گھر بہت ہیں ایسی بہت ہی کم مثالیں ملیں گی - جہاں خاوند اور بیوی میں حد درجہ کی نا اتفاقی یا شکر رنجی ہو *

میرے اس سوال پر کہ " آپ انگلستان کی لڑکیوں کے متعلق کیا خیال رکھتی ہیں " اس نے جواب دیا " وہ بہت بچوں کی سی باتیں کرتی ہیں - ان کے رویہ سے یہ معلوم ہوتا ہے - کہ وہ سنجیدہ ہونا جانتی ہی نہیں - وہ خوشی اور مسرت ہی کو

زندگی سمجھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دُنیا بھر میں اُن کے ملکی مقبوضات نے اُن کو آرام طلب بنا دیا ہے۔ ان کو کسی بارے میں کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہم ایشیا کے باشندے ہمیشہ آئندہ کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اور ہم کو اپنے موجودہ حالات پر سنجیدگی سے سوچنا پڑتا ہے۔ میں نے سوال کیا کہ ”آپ انگریزی لباس طریق نشست و برخاست اور رسومات کو پسند کرتی ہیں یا نہیں“+

اُس نے جواب دیا ”جب تک میں انگلستان میں ہوں۔ میں یہاں کے لباس اور وضع قطع طریق و اطوار اختیار کئے رکھوں گی۔ لیکن اپنے ملک میں واپس جاتے ہی میں پھر اپنے ہاں کے طریقے اور پوشش اختیار کر لوں گی۔ کیونکہ میں یہ نہیں چاہتی۔ کہ میرے ہموطن دُوسروں کی نقل کر کے اپنے قومی اوصاف اور اپنی شخصیت کو مٹا دیں۔ جاپانیوں نے بھی پہلے بہت کامل طور پر یوروپین طریقے رسم و رواج اور لباس اختیار کر لیا تھا۔ لیکن اب وہ پھر اپنے قومی طریقے وغیرہ اختیار کرتے جا رہے ہیں“۔ میں نے سوال کیا ”کیا آپ کا یہ خیال ہے۔ کہ چین والے عیسائی ہو جائیں گے“ اُس نے کہا میرا یہ خیال نہیں عیسائی مذہب کچھ عرصہ کے لئے وہاں خوب ترقی کرے گا۔ لیکن عام طور پر اس کا وہاں رواج نہیں ہوگا+

میں نے پوچھا ”مغرب کے باشندے چین والوں سے اتنے کیوں خوفزدہ ہیں“ جواب میں اُس نے کہا ”کیونکہ چینی بہت جفاکش اور محنتی ہیں۔ اور سفید باشندے اُنکا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب کبھی وہ کسی نئی جگہ پر جاتے ہیں۔ تو وہ چینی مزدوروں سے ہی کام کرواتے ہیں۔ لیکن جب چین والے اس مُلک میں قدم جمانا شروع کرتے ہیں۔ تو وہ اُن کو مُلک بدر کر دیتے ہیں“

میں یہ ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ یہ نوجوان لیڈی نہایت ہی خوبصورت خوش سلیقہ اور سمجھدار تھی+

بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ

(نمبر ۲)

سنہ ۱۸۶۶ء میں ایک جرمن اہل قلم نے اس بات کو نوٹ کیا تھا۔ کہ کس طرح سے انگلستان نے ہندوستان کے کپڑے کی تجارت کو برباد کر کے اپنے کارخانوں کے کپڑوں کو ہندوستان میں رواج دیا۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ انگلستان نے ہندوستانی سوت اور ریشم کے کپڑوں کی آمد کو مکمل طور پر اور قطعی طور پر بند کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک تاگہ بھی ہندوستان سے نہ آسکتا تھا۔ انگلستان کی گورنمنٹ نے یہ بہتر سمجھا۔ کہ انگریز لوگ نہایت کمتر درجہ کا کپڑا اپنی ساخت کا استعمال کریں۔ خواہ وہ کتنا ہی مہنگا ہو۔ مگر ہندوستان کے خوبصورت اور سستے مال کو نہ خریدیں۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں جب پارلیمنٹری تحقیقاتی کمیٹی بیٹھی تو ایک انگریز مسٹر سونڈرس نے اپنی آواز اس ظلم کے برخلاف اٹھائی اور اپنی زوردار تحریروں سے ثابت کیا۔ کہ کس طرح سے انگلستان نے اپنی تجارت کو فائدہ مند بنانے کے لئے ہندوستان کو غریب بنا دیا۔ مسٹر لارپنٹ نے اپنی شہادت میں یہ بات بتلائی۔ کہ جس وقت برٹش ساخت کے ریشمی کپڑے ہندوستان میں صرف ۳½ فیصدی محصول پر داخل کئے جاتے تھے۔ اس وقت ہندوستانی ریشمی کپڑوں پر انگلستان میں ۳۰

فیصدی محصول لگتا تھا۔ چنانچہ اسی مضمون پر ایک انگریز منٹگمری مارٹن کی شہادت بھی اسی امر پر زور دیتی ہے۔ اس نے یہ بتایا کہ ۱۸۱۵ء میں ہندوستانی کپڑے ہندوستان سے باہر قریباً ایک کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ کے جاتے تھے ۱۸۳۲ء میں یہ تجارت گرتے گرتے صرف ۱۰ لاکھ رہ گئی۔ ۱۸۱۳ء میں ولایتی کپڑا ہندوستان میں صرف ۲ لاکھ ۹۳ ہزار روپیہ کا آتا تھا۔ ۱۸۳۲ء میں وہ ۴۰ لاکھ روپیہ کا آیا تھا۔ جب اس نے حسب ذیل شہادت دی:۔

ہم نے ۲۵ سال کے عرصے میں ہندوستان کو مجبور کیا۔ کہ وہ ہمارے مال کو خریدے۔ ہمارے اون کے بنے ہوئے کپڑے ہندوستان میں بلامحصول داخل ہوتے ہیں۔ سوتی کپڑے پر صرف ۲½ فیصدی چنگی لگتی ہے جبکہ اس عرصہ میں ہم نے ہندوستان کے مال پر ۱۰ فیصدی سے لیکر بیس تیس پچاس سو۔ پانچسو اور ہزار فی صدی چنگی لگائی ہے۔ جس سورت۔ ڈھاکہ اور مرشد آباد جہاں کپڑے کی تجارت بڑی تھی برباد ہو گئے ہیں میری رائے میں یہ نتیجہ معمولی تجارت سے حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ اس طاقت کے استعمال سے ہوا جو کہ زبردست کو کمزور پر حاصل ہے۔ اس وقت پارلیمنٹری کمیٹی کے ممبر مسٹر براکزسٹ اور مسٹر مارٹن کے درمیان بڑی بحث ہوئی جس میں مسٹر مارٹن نے ہندوستانی کارخانہ داروں کے حق میں آواز اٹھائی اور مسٹر براکزسٹ نے انگریزی کارخانہ داروں کی طرفداری کی۔ مسٹر مارٹن نے یہ بھی کہا۔ کہ مجھ کو اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ کہ ہندوستان صرف زراعتی ملک ہے۔ ہندوستان اتنا صنعتی اور حرفتی ملک بھی ہے۔ جتنا کہ زراعتی ہے۔ ہندوستان کو محض زراعتی ملک بنا دینا اس کو تہذیب کے زینے سے گرا دینا ہے۔ کیا ہندوستان کو انگلستان کا ایک کھیت

بنا دینا چاہیئے۔ وہ ہمیشہ سے صنعت و حرفت میں مشہور رہا ہے۔ اور اسکی صنعت و حرفت ایسی بڑھی ہوئی تھی۔ کہ کوئی دوسری قوم مساوی شرائط پر اس کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بعد ہمیشہ یہ کوشش ہوتی رہی کہ ہندوستان میں انگریزی مال بلا محصول کے داخل ہو اور بعض اوقات گورنمنٹ انڈیا کو اپنی مرضی کے خلاف پالیسی کے نفاذ دینے پر مجبور کیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب یہ بحث ولایت کے اخباروں میں زوروں پر تھی تو بہت سے انصاف پسند انگریزوں نے صاف صاف اس بات کو تسلیم کیا کہ اس بارے میں ہندوستان کے ساتھ نہایت ظلم اور سختی ہوئی ہے۔ ان میں لارڈ کرزن کا نام نامی بھی آتا ہے۔ اس بارہ میں یہ بیان کر دینے کے قابل ہے۔ کہ جہاں انگریزی حکومت سے ہندوستانی کپڑے کی تجارت بالکل برباد ہو گئی۔ اسی عرصہ میں جاپان نے اس تجارت میں اس قدر ترقی کی کہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد وہ کروڑوں روپیہ کا مال دوسرے ملکوں میں بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی منڈیوں میں بھی جاپانی مال بکثرت فروخت ہوتا ہے۔ گویا ہماری یہ صورت ہے۔ کہ ہم دنیا بھر کے لئے روئی پیدا کرتے ہیں۔ مگر اسی روئی کا بنا ہوا کپڑا کروڑوں روپیہ کا کثیر منافع دے کر دوسروں سے خریدتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ چالیس پچاس سال سے ہندوستان میں بھی کپڑے کے کارخانے لگ رہے ہیں۔ مگر ان کے راستے میں بہت سی دقتیں ہیں۔ اول تو ہندوستان میں اس قدر سرمایہ نہ تھا۔ کہ کثیر کمپنیاں بنا سکتا۔ دوئم ان کارخانوں کے لئے نہ صرف مشینری باہر سے آتی ہے۔ بلکہ ان کے استاد کاریگر بھی باہر سے منگوانے پڑتے ہیں۔ ہماری گورنمنٹ نے ڈیڑھ سو سال کی سلطنت کے باوجود ہندوستانیوں کو زمانہ حال کی صنعتی تعلیم دینے کی کوئی کوشش

نہیں کی۔ اور اگر ہم محض مِل کے کارخانوں پر بھروسہ کرکے اپنی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کریں تو شاید ابھی پچاس سال میں بھی ہم اس قابل نہ ہونگے۔ کہ اپنی ضرورتوں کے لئے کافی کپڑا تیار کر سکیں۔ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں بھی ۹۹ کروڑ روپیہ کا کپڑا ہندوستان میں آیا اور اسی سال میں صرف ۱۲ کروڑ روپیہ کا کپڑا باہر گیا +

اب ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ کون سے ذریعے ہیں جن سے ہم بہت جلد سے جلد عرصے میں اپنی ضروریات کے لئے کافی کپڑا اس ملک میں تیار کر سکیں +

اس ملک میں غیر ممالک کی بنی ہوئی بہت سی چیزیں آتی ہیں مثلاً چمڑے کی چیزیں یا لوہے کی چیزیں یا ادویات یا شیشے کی چیزیں وغیرہ۔ کیونکہ انگریزی عملداری میں ہندوستان سے قریباً ہر طرح کی صنعت و حرفت برباد ہوئی۔ مگر سب سے زیادہ مقدار میں اور سب سے زیادہ قیمت کی جو چیز آتی ہے وہ کپڑا ہے۔ یوں تو انگریزی عملداری سے پہلے اس ملک کے لوگ ہر طرح سے اپنی ضروریات کو پورا کر لیتے تھے۔ اور چمڑا لوہے شیشے کی تمام چیزیں ملک کی ضروریات کے مطابق یہاں پر بنتی تھیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اناج کے بعد جس چیز کی ضرورت ہر ایک اعلیٰ اور ادنےٰ کو پڑتی ہے۔ وہ کپڑا ہے کپڑا اس ملک میں اس قدر عالمگیر بنتا تھا۔ اور ایسا اچھا بنتا تھا۔ کہ امیر اور غریب سب کی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد بہت سا کپڑا ملک سے باہر جاتا تھا۔ مگر آجکل امیر اور غریب سب کی ضروریات کے لئے کپڑا باہر سے آتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام بدیشی چیزوں کے برخلاف جہاد کرنا بیوقوفی میں داخل ہوگا۔ بہت سی بدیشی چیزوں کا منگانا ہماری ترقی کیلئے ضروری ہے

ہماری تحریک کی یہ مرضی نہیں ہے۔ کہ تمام بدیشی چیزوں کی تجارت بند ہوجائے۔ بلکہ اس کی غرض یہ ہے۔ کہ صنعت وحرفت کے میدان میں جو بیچارگی کی حالت ہماری ہوگئی ہے۔ اس کو دُور کیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی مُلک کسی وقت بھی دُوسرے مُلکوں کے ساتھ تجارت کو بند نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تجارت کو بند کرنا پرلے درجے کی بیوقوفی اور نادانی ہوگی مہاتما گاندھی اور کانگریس کے دُوسرے لیڈر ایسے بیوقوف نہیں ہیں کہ ایسی فضول کوشش میں مصروف ہوں۔ اس لئے کسی طرح سے اس قسم کی کوشش کرنے کا ارادہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ بدیشی ساخت کی ایسی چیز کو بائیکاٹ کے لئے منتخب کیا گیا۔ جس نے ہمارے گھروں پر عالمگیر قبضہ کیا ہُوا ہے۔ اور جس کا بائیکاٹ ہم بلا کسی نقصان کے کامیابی سے کر سکتے ہیں کپڑا ایسی چیز ہے۔ جو ہم تھوڑی سی کوشش سے اس مُلک میں اپنی تمام ضروریات کو پُورا کرنے کے لئے پیدا کر سکتے ہیں۔ کپڑا ایسی چیز ہے جس پر ہمارا بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ کپڑا ایسا ہے جس کے بنانے میں ہم کسی وقت میں مشہور تھے۔ اور جس کو ہم مقابلتاً آسانی سے پھر رائج کر سکتے ہیں اور جس کے رواج سے ہم نہ صرف کثیر تعداد اپنے ہموطنوں کو مصروف کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس سے اپنے ملک کی مصیبت زدہ حالت کو بھی بہت حد تک درست کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے فی الحال کپڑے کو بائیکاٹ کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے جو تحریک سودیشی کی جاری رہی اس میں عام طور پر جذبہ مُلک میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور کوشش یہ کی جاتی ہے۔ کہ ہر ایک چیز کو بائیکاٹ کیا جاوے یہ جذبہ بہت اچھا ہے۔ کہ جہاں تک ہو سکے ہم اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزوں کو بدیشی چیزوں پر ترجیح دیں۔ مگر

یہ ظاہر ہے۔ کہ اس میں ہم کو کامیابی پوری طرح سے نہیں ہو سکتی۔ اور علاوہ اس کے ہماری کوشش اس قدر منتشر ہو جاتی ہے۔ کہ ہم اس سے فوری نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ بہتر ہے کہ ایک وقت میں ایک کام کیا جاوے اور اس کے کامیاب ہو جانے پر دوسرا کام شروع کیا جاوے۔ اور اس کے کامیاب ہو جانے پر تیسرا کام شروع کیا جاوے۔ ایک ہی وقت میں تمام بدیشی چیزوں کا بائیکاٹ ناممکن ہے۔ اور اس سے کوئی ایسے نتیجے پیدا نہیں ہو سکتے۔ جن سے ہمارے ملک پر یا غیر ممالک پر بڑا اثر پیدا ہو۔ بعض اوقات ہمارے مخالف یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ ہمارے لیڈر جو کپڑے کے بائیکاٹ کا پرچار کرتے ہیں۔ بدیشی موٹروں پر سوار ہوتے ہیں۔ اور کئی دوسری بدیشی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ جو نقطۂ خیال میں نے اوپر پیش کیا ہے۔ اس کو مدِّ نظر رکھ کر اعتراض بیہودہ ہے۔ میری اپنی رائے ہے۔ کہ جب تک ہم غلام ہیں ہم کو عیش کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اور کہ ہم اپنے عیش کے لئے بدیشی چیزیں کسی مقدار میں خریدتے ہیں۔ تو ہم بڑا پاپ کرتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہم اپنی ترقی کے لئے بھی تمام بدیشی چیزوں کا تیاگ نہیں کر سکتے۔ اور نہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ خصوصاً وہ چیزیں جو ہم کو اپنے کام کرنے میں سہولیت دیتی ہیں۔ ہماری جانب سے اس قسم کی کوشش کرنا کہ بدیشی کتابیں بدیشی کاغذ بدیشی مشینری وغیرہ تمام اشیا کا اس ملک میں آنا بند ہو جاوے۔ ایک مجنونانہ حرکت ہوگی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میرے ہموطن کچھ عرصہ کے لئے بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ کرنے پر اپنی کوشش لگا دیں۔ اور اس چیز کا بائیکاٹ ایسا مکمل ہو جاوے۔ جس سے کہ ہمارے لوگوں کے اندر پولیٹکل اور یکسوئی طاقت پیدا ہو۔ ہم وشواس سے بھر جاویں۔ اور انگریزی قوم پر بھی یہ بات ثابت ہو جاوے۔ کہ اب ہمارے اندر سنجیدگی اور

دانائی سے بھرا ہوا دیش بہت پیدا ہو گیا ہے۔ جب تک ہم اپنی تمام کوشش کو اس کام پر نہ لگا دیں گے۔ اور ایک معقول محدود عرصہ میں اس کو کامیاب کر کے نہ دکھا دینگے۔ تب تک ہمارے لئے کسی دوسرے کام میں ہاتھ ڈالنا اپنی طاقتوں کا انتشار کرنا ہوگا۔ ہمارے بہت سے بھائی یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ سودیشی کا پرچار تو بہت اچھا ہے۔ لیکن بائیکاٹ میں نفرت کا خیال پایا جاتا ہے۔ اور اس لئے ہمکو بائیکاٹ اپنے پراپیگنڈا سے نکال دینے چاہئے۔ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں میں ان کی نیک دلی پر شبہ نہیں کرتا۔ مگر میرے دل میں اس اعتراض کی کوئی وقعت نہیں یہ اعتراض بہت کچھ بے سمجھی کی بنا پر ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے۔ کہ سودیشی اور بائیکاٹ میں کوئی بھید نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا ہے سودیشی کے یہ معنے ہیں۔ کہ اپنے دیش کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کی جاویں۔ یعنی بدیشی چیز استعمال نہ کی جاوے اسی کا نام بائیکاٹ ہے۔ بغیر بائیکاٹ کے سودیشی چل نہیں سکتی۔ اور یہ خیال بھی غلط ہے۔ کہ ہم کو کسی چیز سے بھی نفرت نہیں کرنی چاہئے یہاں تک تو درست ہے۔ کہ ہم کو حتی الامکان کسی انسان سے خواہ وہ کسی رنگ و ملت کا کیوں نہ ہو نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ دنیا کے بعض مہان پرشوں کا یہ شبد ہے کہ ہم کو اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارے دیش کے شرومنی مذہبی پیشوا بھگوان بدھ اور حضرت مسیح کی یہی تعلیم ہے۔ اگر اس تعلیم کو بالکل صحیح مان لیا جاوے تو بھی اس سے یہ لازم آتا ہے۔ کہ ہم نفرت کے خیال کو بالکل اپنے دل سے دور کر دیں۔ بے انصافی ظلم اور تعدی سے نفرت کرنا ضروری ہے۔ غلط خیالات سے نفرت کئے بغیر ہم صحیح خیالات کا پرچار نہیں کر سکتے۔ جھوٹ۔ مکر اور فریب اور دغا اور پاپ سے نفرت کرنا ضروری ہے۔ مہاتما بدھ اور مہاتما مسیح نے بھی ان برائیوں کے برخلاف پرچار کیا اور انسے

نفرت پھیلائی۔ بائیکاٹ میں انسانوں سے اور قوموں سے نفرت کرنا مقصود
نہیں ہے۔ اس کی غرض یہ ہے۔ کہ جس چیز سے ہمارے ملک کو نقصان پہنچتا
ہے۔ اس کو بند کر دیا جاوے۔ قریباً ایک سال کا عرصہ ہوا مہاتما گاندھی جی
بائیکاٹ کو پسند نہ کرتے تھے۔ اور ان کو بائیکاٹ کا لفظ استعمال کرنے میں
اعتراض تھا۔ لیکن اب وہ لفظ بائیکاٹ کا ہر روز استعمال کرتے ہیں اور بدیشی
کپڑے کے بائیکاٹ کا زور شور سے پرچار کر رہے ہیں۔ اس لئے میں اپنے
ہم وطنوں کو یہ جتانا چاہتا ہوں کہ وہ بائیکاٹ کے خیال کو مضبوطی سے اپنے دل
میں جگہ دیں اور خوب زور شور سے اس کا پرچار کریں۔ بدیشی کپڑے کے خلاف
اس قسم کا زبردست خیال پیدا کر دینا چاہیئے۔ کہ کوئی شخص بدیشی کپڑا استعمال
نہ کرے۔ پوچھا جاتا ہے کہ جو بدیشی کپڑے ہمارے گھروں میں ہیں یا ہماری
دوکانوں میں ہیں۔ ان کا کیا کیا جاوے۔ مہاتما گاندھی جی کہتے ہیں۔ کہ گھروں
میں جو بدیشی کپڑا ہے اس کو جلا دیا جاوے یا ملک سے باہر بھیج دیا جاوے
جب تک بدیشی کپڑا ہمارے گھروں میں پڑا رہے گا۔ ہمارے دل میں اس سے
نفرت پیدا نہیں ہوگی اور ہم اس کا استعمال ابھی ترک نہیں کر سکتے۔ کپڑے
کو جلا دینا کیسا ہی برا معلوم ہوتا ہو۔ اور اس میں کتنا ہی نقصان ہو۔ مگر وہ
بائیکاٹ کی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ ہم
غریبوں کو یہ کپڑا دیدیں۔ اچھا نہیں ہے۔ بدیشی کپڑے کو غریبوں کو دے
نا ایک قسم کا پاپ ہوگا۔ کپڑا باہر بھیجنے کا جو خیال ہے وہ بھی صرف تھوڑی حد
تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر مجھے اس میں کچھ عذر نہیں ہمارے ملک
یورپ سے استعمال شدہ پرانے کپڑے لاکھوں روپیہ کے اس ملک میں
بیچنے کے لئے آتے ہیں۔ علاوہ اس کے ہمارے مسلمان بھائیوں کو سمرنا

وغیرہ کے علاقوں میں مدد کی ضرورت ہے۔ اس لئے اگر مسلمان سمرنائی امداد کے خیال سے یا فروخت کی غرض سے بھی ہم بدیشی کپڑے کو باہر بھیجدیں تو اس میں کچھ ہرج نہیں۔ غرض یہ ہے۔ کہ ہم نہ خود اس کا استعمال کریں اور نہ اپنے کسی دوسرے ہموطن کو استعمال کرنے کے لئے دیں۔ جو کپڑا دوکانوں میں پڑا ہے اس کا ترک کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ لوگ اس قدر نقصان اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر میری رائے میں اگر ہمارے کپڑے کے تاجر اتفاق کر اور افریقہ کے منڈیوں میں بھیجدیں۔ تو وہ آسانی سے اس کپڑے کو باہر بھیج سکتے ہیں اس لئے میں اُن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کم از کم یہ تو عہد کریں کہ وہ آئندہ کو بدیشی کپڑے کا کوئی آرڈر نہ دیں گے اور اپنے ہموطنوں کو بدیشی کپڑا خریدنے کے لئے کسی قسم کی ترغیب نہ دینگے۔

ہم اپنے ملک کے کپڑے کے تاجروں سے اس دیش سیوا کے کام میں دیش بھگتی کی سپرٹ (Spirit) کے طلبگار ہیں۔ اگر وہ خوشی سے ہمارے ساتھ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے شامل نہ ہونگے۔ تو اس تحریک کے عالمگیر ہو جانے پر اُن کو مجبور ہونا پڑے گا۔ یہ اُن کا اختیار ہے جو چاہیں وہ کریں۔ ہم جبر کے بالکل خلاف ہیں۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ سودیشی اور بائیکاٹ کے حامی کسی شکل میں بھی اپنے کسی ہموطن پر جبر کا استعمال نہ کریں۔ اگر ہم کارخانوں پر نظر رکھیں تو ابھی عرصہ دراز تک ہم کو انگلستان کا محتاج رہنا پڑے گا۔ کیونکہ مشینری قریباً ساری کی ساری باہر سے آتی ہے۔ اوّل تو آجکل مشینری مشکل سے ملتی ہے اور دو سال تک مشینری کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دوئم مشینری کے لئے کافی تجربہ کار کاریگر ابھی اس ملک میں مہیا نہیں اس لئے یہ ظاہر ہے۔ کہ اگر ہم حقیقت میں بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ کرنا چاہتے

ہیں۔ تو ہمیں مشینری کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے کہ ضروری سپلائی کپڑے کی ہو سکے۔ یہ طریقہ وہی ہے جو اِس مُلک میں انگریزی عملداری سے پہلے جاری تھا۔ یعنے یہ کہ عورتیں اپنے گھروں میں سُوت کاتیں اور اِس مُلک کی کھڈیوں میں اس کا کپڑا بنایا جاوے۔ لوگوں کو اِسپر یہ اعتراض ہے۔ کہ سوت کاتنے کے لئے عورتوں کو کام مزدوری کی صورت میں نہیں ہے۔ کوئی عورت سُوت کات کر اپنا گذارہ نہیں کر سکتی۔ اِس کا جواب یہ ہے۔ کہ کروڑوں عورتیں اِس مُلک میں ایسی ہیں جو سوائے روٹی پکانے اور کاربار خانگی کے اور کوئی کام نہیں کرتیں۔ ابھی تک اِن عورتوں کے لئے کوئی ایسا کام دریافت نہیں ہوا۔ جسے وُہ مُلک کی پبلک لائف میں حصّہ لے سکیں۔ یہی حال ان بیشمار زراعت پیشہ قوموں کا ہے جنکو کوئی کام ایک فصل اور دوسری فصل کے درمیان کرنے کو نہیں ملتا۔ انگریزی عملداری سے پہلے بھی سُوت کاتنے اور کپڑا بُننے کا کام اِس مُلک میں عالمگیر تھا۔ اور اب بھی اگر وہی رواج پھر پھیل جاوے تو مُلک کی یکایک حالت بہت حد تک بہتر ہو سکتی ہے۔ ہاتھ کی دستکاری سے ہم ہندوستان کو تنازعات سے بھی بچا لیں گے۔ جو بڑے بڑے کارخانوں کے قائم کرنے سے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں ٭



پبلک فنڈز

پبلک فنڈ کے متعلق جو کچھ اس وقت تک آریہ سماج کا رویہ ہے۔ وہ نہایت ہی قابلِ تعریف ہے۔ آریہ سماج نے لوگوں کے اندر چندہ دینے اور پبلک چندہ کو نہایت ایمانداری و کفایت سے خرچ کرنے کی عادت ڈالدی ہے اس بارہ میں آریہ سماج کا ریکارڈ عموماً اور کالج پارٹی کا ریکارڈ خصوصاً نہایت ہی شاندار رہ چکا ہے۔ لیکن پبلک فنڈز کے استعمال کے متعلق پبلک جماعتوں کا جو رویہ ہے۔ اس میں کسی قدر تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ملک اس وقت تبدیلی کی ایک عجیب و غریب لہر میں سے گذر رہا ہے ہماری قومی تحریکوں کا مقابلہ ایسی جماعتیں کر رہی ہیں۔ جن کے پاس آدمیوں و روپیہ کی فراوانی ہے۔ ہر سال کثیر تعداد روپیہ کی و آدمیوں کی اس ملک میں داخل ہوتی ہے۔ جس کا دن رات یہی کام ہے کہ وہ ہماری قومی جڑوں کو کمزور کرے اور ہمارے قومیت کے احساس کو نقصان پہنچائے۔ مثلاً جو طاقتیں ہماری اچھوت جاتیوں کو ہم سے علحدہ کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے پاس روپیہ و کام کرنے والے اس کثرت سے ہیں کہ ہم ان کا پوری طاقت سے مقابلہ نہیں کر سکتے اچھوت جاتیوں کی تعداد اس ملک میں قریباً ۶ یا ۷ کروڑ بتلائی جاتی۔ اچھوت جاتیوں کے اندر ہمارا کام نہایت ہی حقیر ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ ہم نے ابتک

وقت کی قدر کرنا نہیں سیکھا۔ اور ہم دن بدن دوسرے کاموں کے مقابلہ میں
اس کام کو کم اہمیت کا سمجھ کر اس کام کی طرف سے غفلت کر رہے ہیں۔ ہندو
جاتی کو جس قدر نقصان اچھوت جاتیوں کی طرف غفلت سے پہنچ رہا ہے۔ وہ
اور کسی دوسرے ذریعے سے نہیں پہنچ رہا۔ مگر تاہم ہم اس کام کی طرف توجہ نہیں دیتے
جب کبھی ملک کے کسی حصہ میں کوئی اچانک واقعہ ہو جاتا ہے جس سے ہندوؤں کی
قوت و طاقت کو نقصان پہنچتا ہے۔ تو ہم واویلا اور ایک دوسرے پر الزام لگانا شروع
کرتے ہیں۔ اس وقت کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر کچھ روپیہ بھی جمع کرتے ہیں۔
اس میں سے کچھ خرچ کر کے باقی کو جمع رکھتے ہیں۔ بہت سا روپیہ بغیر ضرورت شاندار
عمارتوں میں بند کر دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ موجودالوقت ضروریات کے لئے
موجودہ روپیہ کو خرچ کریں۔ اور آئندہ کو آنے والی نسلوں پر چھوڑ دیں۔
ہم ایک بخیل کی طرح سے اپنی اولاد کے لئے سرمایہ جمع کرنے کا زیادہ فکر کرتے
ہیں۔ ضرورت اس امر کی زیادہ ہے کہ ہندو اس صداقت کو سمجھ لیں۔ کہ شخصی
اور قومی اور جماعتی حیثیت سے روپیہ جمع کر کے آئندہ نسلوں کے واسطے چھوڑ
دینا درست نہیں ۔

ہر ایک شخص کو اپنے بچوں سے محبت ہے اور اسی طرح سے موجودہ نسل کو
آئندہ نسلوں سے محبت ہے۔ ہر ایک شخص اپنے بچوں کے لئے جائداد جمع کرنیکی
فکر کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ بچے کاہل وجود ہو کر اس جمع شدہ روپیہ
کو عیش و عشرت میں خرچ کرتے ہیں جس ہوشیاری سے ایک خاندان کا بانی زر و
جمع کرتا ہے۔ وہ ہوشیاری عموماً اس کے وارثوں میں نہیں پایا جاتا۔ دولتمندوں
کی اولاد عموماً سست۔ کاہل وجود۔ بے اصول اور عیاش ہوتی ہے۔ بخیلوں کا
روپیہ عموماً ان کے بچے عیاشی میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ ہم کو ہر روز تجربہ سے

دکھائی دیتا ہے۔ روپیہ بذاتہٖ خود زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ روپیہ کی غرض یہ ہے۔ کہ اس سے انسان کو ضروریات زندگی حاصل کرنے میں مدد ملے۔ روپیہ کے مقابلہ میں انسانوں کے وجود اور انسانوں کی آتمائیں زیادہ قیمتی ہیں۔ وہ شخص جو اپنے کمائے ہوئے یا جمع کئے ہوئے روپیہ کا بہترین استعمال کرتا ہے جو اس کو اپنی اولاد اپنے پڑوسیوں۔ اپنے ہم مذہب وہم قوم انسانوں کی رکشا و حفاظت کی بہتری میں خرچ کرتا ہے۔ اس دوسرے شخص سے لاکھ درجہ زیادہ عقلمند و دانا ہے۔ جو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت اس کی جسمانی و روحانی ضروریات سے روپیہ بچا کر بہت سارا روپیہ اس کو وراثت میں دے جاتا ہے۔

اس معاملہ میں ہندو دیگر قوموں کی نسبت زیادہ کمزور رہیں۔ اسی کمزوری سے قوموں کو محفوظ کرنے کے لئے بعض بزرگانِ دین نے سود کھانے کو حرام قرار دیا ہے۔ سود لینا صرف اسلام میں ہی حرام نہیں ہے۔ بلکہ بعض ہندو شاستر بھی اس کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اس حکم کی تہ میں وہی اصول ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ جب تک مسلمان سود کھانے کو حرام سمجھتے رہے اور انہوں نے موجودہ زمانہ کے طریق تمدن کو اپنا خدا نہیں بنایا۔ تب تک مسلمان اپنی قومی کشمکش میں دوسری قوموں سے بالاتر رہے۔ اب بھی مسلمان اس بارہ میں ہندوؤں سے بہتر ہیں۔ اوسط درجہ کا مسلمان اسی حیثیت کے ہندو کے مقابلہ میں اچھا کھاتا ہے۔ اچھا پہنتا ہے۔ اچھا رہتا ہے۔ روپیہ کے الجھاؤ سے اُس کے اندر بیخوفی و دلیری زیادہ بنی رہتی ہے۔ جو مسلمان امیر کبیر و صاحبِ جائداد روپیہ کے پھیر میں پڑ گئے ہیں۔ ان کو روپیہ کی فکر رہتی ہے۔ اصولوں کی ذرا پرواہ نہیں۔ روپیہ والے ہندو مسلمانوں کا خدا روپیہ ہے۔ جائداد والوں کو دنیا کے تمام اصولوں کے مقابلہ میں جائداد زیادہ پیاری ہے۔ خلافت بھاڑ میں جائے۔

اچھوت سب عیسائی ہو جائیں ۔ ملک کا بیڑا غرق ہو ۔ ہندوستان ہمیشہ کے لئے غلام رہے ۔ ہندو مریں یا جئیں ۔ مسلمان تباہ ہوں یا آباد ۔ ان متمول و صاحب جائداد اصحاب کو سب سے مقدم و سب سے زیادہ خیال اپنے روپیہ کا اور اپنی جائداد کا ہے ۔ اسی اصول پر حضرت مسیح نے یہ کہا تھا کہ کسی ہاتھی کے لئے سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا ممکن ہے ۔ مگر کسی دولتمند کا بہشت میں جانا ناممکن ہے ۔ اگر مسلمانوں کو اس وقت خلافت کی پرواہ ہوتی تو وہ کروڑوں روپیہ آسانی سے اسکے لئے جمع کر سکتے ہیں ۔ میں نے بیسیوں متمول مسلمانوں کو دیکھا ہے کہ وہ خلافت کے دکھ سن کر آنسو بہاتے ہیں ۔ لیکن جب چندہ دینے کا وقت آتا ہے ۔ تو ایک روپیہ سے شروع کرتے ہیں ۔ یہی حال ہندوؤں کا ہے ۔

دولت اور جائداد کا خیال باقی تمام اچھے بھاوؤں کو دبا دیتا ہے ۔ یہ اصول جیسا شخصی زندگی میں سچا ہے ۔ اسی طرح سے جماعتی زندگی میں بھی یہ سچا ہے جن پبلک جماعتوں کو روپیہ جمع کرنیکی عادت دامنگیر ہوتی ہے ۔ وہ ہر سال جائنٹ سٹاک کمپنیوں کیطرح اپنا بیلنس شیٹ دیکھ کر خوش ہوتی ہیں ۔ مگر نہیں سوچتیں کہ اگر اس جمع کردہ روپیہ کو استعمال کیا جاتا اور اسکو سوسائٹی کے دکھ دور کرنیمیں خرچ کیا جاتا تو نتیجہ زیادہ اچھا ہوتا ۔ میں اس بات کا وکیل نہیں ہوں کہ انسٹی ٹیوشنوں کے مستقبل کے لئے کچھ انتظام نہ کیا جائے ۔ اگر دولتمند آدمی انسٹی ٹیوشنوں کے لئے مستقل عطیہ جات دیتے ہیں ۔ تو انمیں مجھے اعتراض نہیں ۔ لیکن میری رائے میں کسی پبلک جماعت کے لئے ہمیشہ کیلئے روپیہ کو جمع رکھنے کی فکر کرنا آئندہ آنیوالی نسلوں کو کاہل بناتا ہے ۔ جسطرح شخصی زندگی میں بخیل موجود الوقت فائدہ کو قربان کر کے اپنی اولاد کے لئے روپیہ جمع کرتا ہے ۔ اسی طرح وہ پبلک جماعتیں جو موجودہ ضروریات کو قربان کر کے آئندہ کے لئے اپنے خزانے پر کرتی ہیں وہ اپنے روپیہ و اپنی طاقتوں کا بہترین استعمال نہیں کرتیں ۔

ہم کو عام طور پر اس بات کی شکایت ہے۔ کہ پبلک کام کرنے والے نہیں ملتے لیکن جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ پبلک کام کرنے والے کو روٹی کپڑے کے فکر سے آزاد کیا جائے۔ تو ہم ان کو (Sweat) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے اچھا پبلک کام کرنیوالا بلاشبہ وہ ہے۔ جو نہایت سادگی سے زندگی گذارتا ہے۔ جو پبلک فنڈ پر کم سے کم بار ڈالتا ہے۔ لیکن اس سے دوسرے درجہ پر وہ پبلک خادم ہے۔ جو اپنا تمام پورشارٹھ اور وقت دیتا ہؤا سادگی سے ذرا بہتر زندگی گذارنے کی خواہش کرتا ہے ؛

میری رائے میں پبلک فنڈز میں مستقل سرمایہ جمع کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ اس کو موجود الوقت ضروریات کے لئے خرچ کیا جائے۔ البتہ اس قدر احتیاط درکار ہے کہ ایسا نہ ہوا چانک کام بند ہو جائے۔ اور جو خرچ کیا جائے۔ اس سے بہترین نتائج حاصل ہوں۔ تھوڑا سا آگے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مگر پچاس برس یا صدیاں آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پولٹیکل اکانومی کا ایک یہ اصول ہے۔ کہ کسی گورنمنٹ کو حق نہیں ہے کہ روپیہ اپنی ضروریات سے زیادہ وصول کرکے آئندہ کے لئے اپنا خزانہ بھرنے کی کوشش کرے۔ پرانے بادشاہ یہ کیا کرتے تھے۔ مگر جمہوری انتظام میں یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا۔ قوم سے جسقدر روپیہ وصول کیا جائے وہ قوم کی ترقی کے لئے اور اس کی ضروریات کے لئے خرچ کیا جائے۔ گورنمنٹیں آنے والی نسلوں کے لئے حفاظت و ترقی کا سامان مُہیا کرتی ہیں۔ خصوصاً جنگ کے ایام میں تمام گورنمنٹیں قرضہ لے کر اپنی حفاظت کرتی ہیں۔ میرے خیال میں اس وقت ہندوستان کی تمام پبلک جماعتوں کو اسی اصول پر عملدرآمد کرنا چاہیئے ؛

اس وقت ہمارے سامنے دو قسم کی جنگ ہے۔ ایک کو ہم جنگِ آزادی

کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو جنگی ترقی - گو آخری تشریح میں دونوں ایک ہی ہو جاتے ہیں - قوم کو مذہبی - سوشل تعلیمی تجارتی اور پولٹیکل ترقی کی ضرورت ہے اور اس کے لئے روپیہ اور کام کرنے والوں کی ضرورت ہے - اس لئے ہمارا بہترین فرض یہ ہے - کہ اس وقت جسقدر روپیہ بھی ہم اپنی پرائیویٹ و خاندانی ضروریات سے بچا کر قومی ترقی کے لئے لگا سکیں لگا دیں - یہی ہمارا بہترین وانوسٹمینٹ سرمایہ ہو جائے گا - اس میں بخل کرنا نادانی ہے - اکثر کہا جاتا ہے کہ ہمارے بچے ہمارا بہترین سرمایہ ہے - اور ان بچوں کو زندگی کے لئے تیار کرنا ہمارا بہترین Investment ہے - اگر کوئی بخیل اپنے بچوں کی تعلیم پر - ان کی صحت پر اور ان کی آئندہ ترقی پر روپیہ خرچ کرنے کے بجائے اپنے بچوں کو حالت جہالت اور جسمانی و دماغی کمزوری میں رکھتا ہوا ان کے لئے روپیہ جمع کر کے چھوڑ دیتا ہے تو وہ دانا نہیں کہا جا سکتا - اسی طرح پبلک جماعتوں کو مستقل سرمایہ چھوڑنے کی فکر نہ کرنی چاہیئے - ان کو اپنی آمدنی کا بڑا حصہ موجود الوقت ضروریات کے پورا کرنے میں خرچ کر دینا چاہیئے - ان کے لئے خزانے جمع کرنا و محلات بنانا و چھوڑنا ہمارا فرض نہیں ہے - اس لئے میں اس بات کے خلاف ہوں - کہ ہم پبلک روپیہ جمع کرتے جائیں - اور اس کو ایسی بخیلی سے خرچ کریں کہ ہمارے کام میں نقص واقع ہو یا اس سے پورے نتائج نہ نکلیں - ایسی صورت میں ہمارا دھیان روپیہ کے بچانے پر نہیں ہونا چاہیئے - ہماری توجہ اپنے روپیہ کو کفایت سے خرچ کر کے اس سے بہترین نتائج حاصل کرنے پر مبذول ہونی چاہیئے - دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس روپیہ سے پبلک کے لئے اپنی قوم کیلئے کس طرح اپنے کام کو وسعت دے سکتے ہیں - اکثر اوقات ہم روپیہ بچانے کی نیت سے اپنے کام کو محدود رکھنے کی کوشش کرتے ہیں - اور پھر

سود خواروں کی طرح سے اس روپیہ کو ہمیشہ بڑھتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ پھر ایک نئی ضرورت کے لئے نیا روپیہ مانگتے ہیں۔ اور جب تک روپیہ کافی مقدار میں ہمارے ہاتھ میں نہیں آ جاتا پچھلے جمع کئے ہوئے روپیہ کو ہاتھ لگانا پاپ سمجھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ایک غرض کے لئے جمع کیا ہوا روپیہ ہمیں دوسری غرض میں خرچ نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن ایک غرض کے لئے جمع کیا ہوا روپیہ اس غرض پر خرچ کر دینا اور اسے اس میں سے بچانے کی کوشش نہ کرنا بھی ہمارا دھرم ہے۔

بعض بعض اغراض ایک دوسرے کے ساتھ ایسی ملی جلی ہوتی ہیں کہ ہم نہایت ایمانداری سے بلا کسی خلاف ورزی اصول کے ایک غرض سے جمع کئے ہوئے روپیہ کی بچت کو اسی قسم کی دوسری غرض پر خرچ کرنے میں حق بجانب ہیں۔ میری رائے میں وقت آ گیا ہے کہ ہم پبلک فنڈز کو جمع رکھنے کی عادت میں کسی قدر تبدیلی کریں۔ ہمارے ملک و ہماری قوم کو اس وقت ترقی کے لئے۔ حفاظت کے لئے۔ بچاؤ کے لئے اور اصلاح کے لئے بہت روپیہ کی اور بہت سے کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ اس واسطے موجودالوقت ترقی کی رفتار کو روپیہ کے اجتماع پر ترجیح نہیں دینی چاہیئے۔ ہمیں اپنے روپیہ کا بہترین استعمال کرنا چاہیئے۔ مگر استعمال ضرور کرنا چاہیئے۔ ہندو قوم میں بیشمار کمزوریاں ہیں۔ اچھوت جاتیوں کے ادھار و تعلیم کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں کو مقدمہ بازی سے بچانے کی ضرورت ہے۔ ملک کے نوجوانوں کے لئے آزادانہ روزی کمانے کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ ہندو لڑکیوں کو تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ وغیرہ وغیرہ بیسیوں ضرورتیں ہیں۔ جن کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ ایسے وقت میں پبلک فنڈز کو جمع کر کے آئندہ صدیوں کا

انتظام کرنا بہترین طریقہ قومی حفاظت کا نہیں ہے - بہتر یہ ہے کہ ہم اپنی تمام کوششوں کو زیادہ بہتر اور زیادہ بار آور بنا کر تھوڑے وقت میں وہ نتیجہ حاصل کریں جس کو آہستہ روی اور روپیہ کے اجتماع سے ہم صدیوں میں حاصل کرنے کی بنیاد ڈال رہے ہیں - قومی روپیہ کا بہترین Investment یہ ہے کہ وہ قومی ضرورتوں کو پورا کرنے میں صرف کیا جائے - جیسا شخصی دولت کا بہترین استعمال یہ ہے - کہ وہ خاندان کی ضرورتوں پر خرچ کیا جائے بخیلی صرف پرائیویٹ جائداد کے متعلق ہی نہیں ہوتی - بلکہ پبلک فنڈز کے متعلق بھی ہو سکتی ہے جس طرح پرائیویٹ زندگی میں بعض انسانوں کی تمام کوششیں یہ ہوتی ہیں - کہ خرچ کم ہو اور روپیہ بچایا جائے - اسی طرح پبلک زندگی میں بھی بعض آدمیوں کا میلان طبع یہی ہوتا ہے - اس قسم کے آدمی جن کی نیک نیتی - قومی ہمدردی - ایثار نفسی اور بے غرضی میں کسی کو کلام نہیں تمام جماعتوں میں پائے جاتے ہیں - انڈین نیشنل کانگرس کے لیڈروں میں بھی ایسے آدمی ہیں - آریہ سماج - برہمو سماج اور سناتن دھرم سبھا میں بھی ایسے آدمی ہیں - ہم ان سے نہایت ادب سے درخواست کرتے ہیں - کہ وہ اس بارہ میں اپنے نقطۂ خیال کا امتحان کریں ؟



زبان کی غلامی

غلامی کی علامتیں و نتائج مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ غلام کو اپنے آقا کی زبان بولنی پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی زبان بھول جاتا ہے۔ اور اس کی زبان وہی ہو جاتی ہے۔ جو اس کے آقا کی تھی افریقہ کے حبشیوں کو یوروپین اقوام نے غلام بنایا۔ وہ اپنی اپنی زبانیں بھول گئے اور جس قوم نے ان کو غلام بنایا ان کی زبان انہوں نے اختیار کر لی۔ ممالک متحدہ امریکہ میں جو حبشی غلام ہو کر گئے۔ انہوں نے انگریزی سیکھ لی۔ اور اب انگریزی ان کی مادری زبان ہو گئی۔ اس وقت سارے ممالک متحدہ میں ایک بھی ایسا حبشی نہ ملے گا۔ جو اپنی اصلی مادری زبان جانتا ہو۔ اسی طرح جو حبشی جنوبی یا وسط امریکہ یا میکسیکو میں غلام ہو کر گئے۔ انہوں نے ہسپانیہ یا پرتگال کی زبان سیکھ لی۔ یورپ میں جو حبشی جس جس ملک میں غلام ہو کر گئے۔ انہوں نے وہیں کی زبان سیکھ لی۔ غلامی کے علاوہ جو لوگ ایک ملک و قوم کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جاتے ہیں۔ اور وہاں کی مستقل رہائش اختیار کر کے اپنے آپ کو ایک نئی قومیت کا رکن بناتے ہیں۔ وہ بھی آہستہ آہستہ اپنی زبان بھول جاتے ہیں۔ اور ان کے بچے اپنے نئے ملک کی زبان سیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح امریکہ میں جو قومیں آباد ہوئیں۔ ان میں

سے اکثر نے دُوسری یا تیسری نسل میں اپنی زبان بالکل بھُلا دی۔ لیکن آزاد انسانوں کی حالت میں کچھ عرصہ تک اپنی پرانی زبان کے ساتھ اُنس و محبت بھی رہتی ہے چنانچہ امریکہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں آدمی ایسے ملیں گے۔ جنہوں نے امریکہ کی مُستقل رہائش اختیار کرنے و انگریزی زبان سیکھ لینے کے باوجود بھی اپنی مادری زبان کو نہیں بھُلایا۔ امریکہ میں قریباً دُنیا کی تمام زبانیں بولی جاتی ہیں اور دُنیا کی تمام لیٹری زبانوں میں اخبار و کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ یہ بقایا ہے۔ اس محبت و انس کا جو آزاد انسانوں کو اپنی مادری زبان سے رہتا ہے۔

دُنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پولیٹیکل انقلابات و پولیٹیکل غلامی سے بھی زبانوں میں تبدیلیاں و انقلابات ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً عرب حملہ آور جہاں گئے وہاں اُنہوں نے عربی زبان کو پھیلایا۔ اس وقت مصر و شمالی افریقہ کے تمام باشندوں کی خواہ وُہ عرب نسل سے ہوں یا حبشی نژاد یا کسی اور نسل کے زبان عربی ہے۔ برخلاف اس کے ایران و افغانستان کے باشندوں کی زبان فارسی ہے۔ ترکستان کی ترکی۔ اسی طرح ہندوستان نے بھی ایکہزار برس تک مسلمانوں کی پولیٹیکل ماتحتی کے باوجود اپنی زبان کو نہیں چھوڑا۔ ہندوستانی زبان میں عربی و فارسی کے بہت سے لفظ شامل ہو گئے۔ مگر ہندوستانی کی بُنیاد و ہندوستانی زبان کا ذخیر ہندوستان کی قدیم زبان ہی ہے۔ ہندوؤں نے ایک ہزار برس کی پولیٹیکل ماتحتی کے باوجود اپنی زبان کو کسی بڑی حد تک تبدیل نہیں کیا۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ ہندوؤں نے ایک منٹ کے لئے بھی مُسلمانی تہذیب کو اپنے سے برتر اور بہتر نہیں مانا۔

مُسلمانی تہذیب کا ہندو مذہب و ہندو کلچر پر اچھا خاصہ اثر پڑا۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اور اسی طرح مُسلمانی تہذیب و کلچر مُسلمانی مذہب و

مسلمانی معاشرت پر ہندو تہذیب اور ہندو مذہب کا بھی نمایاں اثر ہوا لیکن تاہم ہندوؤں نے کبھی مسلمانوں کی برتری کو تسلیم نہیں کیا۔ پولیٹکل طور پر انکے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ مگر مذہبی طور پر کلچرل طور پر یا اخلاقی طور پر اپنی ہار تسلیم نہیں کی۔ مسلمانوں کے عہد میں لاکھوں ہندوؤں نے فارسی و عربی پڑھی۔ کروڑوں مسلمان ہوگئے۔ مگر ہندوؤں کی عام جماعت نے نہ اپنا مذہب تبدیل کیا اور نہ اپنی زبان تبدیل کی اور اپنے طریق رہائش و معاشرت میں ایسی تبدیلیاں آنے دیں۔ جس سے کوئی یہ کہہ سکے کہ وہ ہندو نہیں رہے۔ اصل میں اگر غور سے دیکھا جائے تو ہندوؤں نے پولیٹکل طور پر بھی کبھی اپنی شکست کو آخری و قطع تسلیم نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اپنی آزادی کے لئے جدّ و جہد کرتے رہے۔ مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان کو اپنا گھر اپنا وطن بنا لیا اور گو انہوں نے ہندوؤں پر حکومت کی۔ مگر ہندوؤں سے وصولی چندہ ٹیکس کو کسی غیر ملک میں خرچ نہیں کیا انہوں نے بہت حد تک اپنی رعایا کی زبان اور ان کی کلچر کو اختیار کر لیا۔ مگر انگریزی راج میں ٹھیک اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ لاکھوں ہندو گھرانے اس وقت اس ملک میں ایسے ہیں۔ جن کے ارکان انگریزی تہذیب کو اپنی تہذیب سے برتر مانتے ہیں۔ اور جن کی کوشش یہ ہے کہ قریباً ہر بات میں انگریزوں کی نقل کریں جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہندو مسلمان دونوں اپنی قومیت کو گنوا رہے ہیں اور اپنے مستقبل کے راستہ میں کانٹے بو رہے ہیں۔

میں انگریزی زبان کے مطالعہ کے خلاف نہیں۔ نہ میں مغربی تہذیب کے برخلاف ہوں۔ میری رائے میں غیر زبانوں کی واقفیت اور غیر زبانوں میں سے انگریزی کی واقفیت ہماری تعلیم کا ایک ضروری جزو ہونی چاہیئے۔ لیکن مجھے اس امر کا رنج ہے۔ کہ ہم اپنی زبان کی طرف سے غافل ہو کر ایک غیر زبان کو اپنے ذاتی

دماغ پر اس قدر حکومت دے رہے ہیں۔ جو ہم کو قومیت کے ایک ضروری معیار سے نیچے گرا رہی ہے۔ ہندوستان کے بعض صوبجات میں تعلیم یافتہ جماعت نے اپنی اس کمزوری کو اچھی طرح پہچان کر اس کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اس کوشش میں ان کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔ مثلاً ہمارے بنگالی اہل وطن نے اس بارے میں بہت کچھ کیا ہے۔ بنگالی تعلیم یافتہ وغیرہ تعلیم یافتہ سب ہی عموماً اپنی زبان کا استعمال نہایت شوق سے کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے مہاراشٹر و گجراتی بھائی بھی اپنی زبانوں کو بہت تقویت دے رہے ہیں۔ مگر اہل پنجاب و یو۔پی والے اس بارہ میں سب سے بڑے مجرم ہیں۔ اکثر تعلیم یافتہ پنجابی انگریزی میں گفتگو کرنا۔ انگریزی میں خط و کتابت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سڑکوں پر چلتے پھرتے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ عموماً نوجوان انگریزی میں باتیں کرتے ہیں۔ ریل میں بیٹھے ہوئے بھی انگریزی میں گفتگو سنائی دیتی ہے۔ خط و کتابت بھی بغیر ضرورت کے انگریزی میں ہوتی ہے۔ اور سب سے ناقص یہ امر ہے۔ کہ بہت سے پنجابی گھرانوں میں "ٹیبل ٹاک" بھی انگریزی میں ہوتا ہے۔ اس قدر انگریزی جاننا کہ جس سے میز پر کھانا کھاتے ہوئے انگریزی میں گفتگو کر سکیں۔ ہماری نئی مستورات کی تعلیم کا ضروری جزو سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہماری غلامی کی قیمت اور اس کی زبردست شہادت ہے۔ دنیا کے پردے پر ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ کہ خاوند بیوی کو اور بیوی خاوند کو ایک غیر زبان میں خط لکھے۔ یا بیٹا باپ کو اور باپ بیٹے کو غیر زبان میں خط لکھے لیکن اس ملک میں لاکھوں تعلیم یافتہ [illegible] کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ ہندوستانی کلب گھروں میں عموماً گفتگو انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی جب سوشل موقعوں پر اکٹھے ہوتے ہیں تو انگریزی میں گفتگو کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ لوگ دیدہ و دانستہ

ایسا نہیں کرتے۔ بلکہ اب تو ان کی عادت ہی ایسی ہو گئی ہے ۔
جب میں طالبعلم تھا تو سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے یہ قاعدہ جاری کیا
تھا کہ کوئی لڑکا سکول کے احاطے میں سوائے انگریزی کے اور کوئی زبان نہ
بولے۔ اب بھی شاید بہت سے سکولوں اور کالجوں میں یہ قاعدہ جاری ہے
اس کے علاوہ ہماری تعلیم کا بڑا بھاری حصہ انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔
ہم انگریزی کتابیں پڑھتے ہیں۔ انگریزی اخبار پڑھتے ہیں۔ اور انگریزی میں
ہی سوچتے ہیں۔ اس لئے انگریزی ہم کو زیادہ آسان پڑتی ہے۔ اور چونکہ اس
میں سہولیت ہے۔ اس لئے اس سہولت کا شکار ہو کر ہم اس سے بچنے کی
کوئی جدوجہد نہیں کرتے۔ یہ ہماری قومی گراوٹ کی سب سے زبردست علامت
ہے۔ ہماری کامیابی کا نشان انگریزی زبان کی واقفیت ہے۔ ہماری سوسائٹی
میں سب سے لائق وہ شخص ہے۔ جو انگریزی اچھی لکھتا اور انگریزی اچھی بولتا
ہے۔ ہمارے پروفیسروں اور استادوں میں سب سے زیادہ تنخواہ اس کو ملتی
ہے۔ جو انگریزی زبان میں زیادہ لیاقت رکھتا ہو۔ آخر اس کا انجام کیا ہو گا
یہ تو ممکن نظر نہیں آتا کہ انگریزی ہندوستان کی قومی زبان بن جائے۔
بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ مدراسی سب اپنی اپنی زبانوں کو ترقی دینے میں مصروف
ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ انگریزی نے جو رسوخ ان کے دل و دماغ پر
حاصل کیا ہے۔ اس کو کم کیا جائے۔ مگر پنجابی اس بارے میں بالکل کوئی کوشش
نہیں کر رہے۔ اور چونکہ انگریزی ہمارے دل پر قابو پا چکی ہے۔ اس لئے اسکو
اپنے سنگھاسن پر سے اتارنے میں وقت لگے گا ۔
میری رائے میں ہر ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی کو کوشش کرنی چاہیئے
کہ وہ انگریزی زبان کے استعمال کو حتی الوسع کم کرتا جائے ہر ایک شخص کو

چاہیئے۔ کہ ہندوستانی زبان میں مطبوعہ اخبارات خریدنے اور پڑھے۔ اردو و ہندی کے رسالہ جات منگوایا کرے۔ اور تھوڑا بہت وقت اردو و ہندی کی لٹریچر کے پڑھنے میں صرف کرے۔ لڑکوں کی ابتدائی تعلیم میں انگریزی پانچ سال سے پہلے شروع نہیں ہونی چاہیئے اور لڑکیوں کی تعلیم میں ۸ سال سے قبل انگریزی نہیں پڑھانی چاہیئے۔ صرف اُن لڑکوں و لڑکیوں کو انگریزی پڑھانی چاہیئے۔ جو پہلے اپنی زبان میں اچھی مہارت و لیاقت پیدا کرلیں۔ صرف ایسی لڑکیوں کو انگریزی پڑھانی چاہیئے۔ جن کے لئے انگریزی میں کم از کم اس قدر لیاقت پیدا کرنا ممکن ہو کہ وہ انگریزی کی لٹریچر کو پڑھ سکیں ہر ایک ہندوستانی قوم پرست کے دل میں اپنی قومی زبان کے واسطے پیار و محبت ہونی چاہیئے۔ ہر ایک کا یہ فرض ہے۔ کہ قومی زبان کو ترقی دے۔ اور غلامی کی اس علامت کو کم از کم اسقدر کم کردے جتنی کہ حالات اسکو کم کرنے کی اجازت دیتے ہیں ۔



پوشاک کی غلامی

غلامی بہت بُری چیز ہے۔ خواہ شخصی ہو یا قومی۔ غلام کی نیچر (خاصیت) میں اس قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو اس کی پیشانی پر غلامی کی مہر لگا دیتی ہے اور جو اس کی طبیعت میں یہ تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ کہ وہ ان تمام تبدیلیوں پر فخر کرنے لگتا ہے اور ان کو اپنی سیلف رسپکٹ کے لئے ضروری سمجھنے لگتا ہے ہمارے دوست مسٹر اینڈریوز کا یہ دعوے ہے۔ کہ پولیٹیکل غلامی نے ہندوستانیوں میں اس قسم کی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ جو ان کی قومی شان کے بالکل برخلاف ہیں اور جو قومی زندگی کے راستہ میں سدِّ راہ ہیں۔ مجھے بھی اس قسم کی بہت سی باتوں کا تجربہ ہے۔ اس لئے میں اینڈریوز صاحب کی بیان کردہ اور اپنے مشاہدہ میں آئی ہوئی باتوں کا مختصراً ذکر یہاں کروں گا۔ تاکہ ہمارے ہموطن یہ محسوس کر سکیں کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ زبان کے متعلق میں پہلے آرٹیکل میں لکھ چکا ہوں ۔

(۱) پوشاک کے معاملے میں ہندوستانی تعلیم یافتہ جماعت نے ایسی بیضرورت تبدیلیاں اختیار کی ہے۔ جن سے تکلیف اور خرچ دونوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ یوروپ کی پوشاک یوروپ کی آب وہوا کے موافق ہے۔ وہ صدیوں میں بنی ہے۔ اور ان کی ضروریات کے مطابق ہے۔ انگریزی پوشاک میں بعض خوبیاں ضرور ہیں۔ مگر عام طور پر وہ ہندوستان کی آب وہوا میں نہ صرف غیر ضروری ہے

بلکہ مضر ہے۔ انگریزوں و اہل یورپ کو چست پوشاک کی ضرورت ہے ہندوستانیوں کو اپنی تندرستی کے لئے ڈھیلی پوشاک کی ضرورت ہے۔ انگریزوں کو زیادہ پوشاک کی ضرورت ہے۔ ہندوستانیوں کا گذارہ بہت کم کپڑوں میں ہو سکتا ہے انگریزوں کو گرم کپڑے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں سے صرف پنجابیوں اور یو۔ پی والوں کو چند مہینے کے لئے گرم کپڑوں کی ضرورت ہے۔ انگریز ایک دولتمند قوم ہے۔ ان کے ہاں کپڑے کی ساخت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ دنیا بھر کو کپڑا مہیا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ زیادہ کپڑا اُبنتے ہیں اور پوشاک کا سٹینڈرڈ وفیشن اپنی ماتحت اقوام کے لئے قائم کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے کپڑے کی بکری زیادہ ہو۔ انکی پوشاک کی سلائی کپڑے کی قیمت سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے ملک میں ہاتھ کی مزدوری کی شرح بہت زیادہ ہے۔ کپڑے کی کانٹ چھانٹ کو انہوں نے ایک آرٹ کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ اس کی نقل کرنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ صرف پوشاکیں بنوانے میں خرچ کرتے ہیں ؛

انگریزوں کی نقل میں ہندوستانی تعلیم یافتہ انگریز درزیوں سے کپڑا سلاتے ہیں اور اس طرح محض پوشاک کے ذریعہ اپنی آمدنی کا معقول حصہ انگریزوں کی پاکٹ میں ڈال دیتے ہیں۔ انگریزوں کی تشریف آوری سے پہلے جو ہندوستانی پوشاک تھی وہ نہایت معقول اور خوبصورت تھی۔ انگریزوں نے ہندوستانی پوشاک کو دیکھ کر اپنی پوشاک میں بعض مختصر سی تبدیلیاں کر لی ہیں مگر ہندوستانی تعلیم یافتہ جماعت نے وہ تبدیلیاں بھی انگریزوں کی نقل میں کی ہیں۔ انگریزی میں پوشاک میں کپڑے کا خرچ زیادہ۔ سینے کا خرچ زیادہ۔ سلائی کا خرچ زیادہ اور تکلیف زیادہ۔ مگر باوجود اس کے ہزاروں تعلیم یافتہ ہندوستانی

انگریزی پوشاک کو اپنی شان کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ انڈریوز صاحب نے ایک ولایت سے واپس آئے ہوئے ہندوستانی کا ذکر کیا ہے۔ موسم گرمی کا تھا۔ گرمی اور شور سے پڑ رہی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے سخت کالر لگایا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے زیب دے رہے تھے۔ چست واسکٹ و چست پتلون پہنے ہوئے تھے۔ گرمی کے مارے بدن پگھلا جاتا تھا۔ انگریزی زبان میں فرمانے لگے یہ کیسا وحشیانہ ملک ہے۔ میرا جی چاہتا ہے ولایت کو واپس چلا جاؤں۔ یہاں پر تو ہر طرح کی تکلیف ہے۔

اُن کو یہ خیال نہ آیا کہ خدا نے یہ ملک اس پوشاک کے لئے نہیں بنایا۔ بعض بیرسٹر صاحبان کو ابتدا میں اس قدر آمدنی نہیں ہوتی۔ کہ وہ آرام سے اس میں کھانے پینے کا بھی انتظام کر سکیں۔ لیکن سوٹ "فلپس" کے کارخانہ کا سلا ہوا ضرور ہوتا ہے۔ نکٹائی اور کالر بھی ضروریات سے ہیں۔ خواہ وہ مڑی ہوئی میلی و پرانی ہی کیوں نہ ہوں۔ شام کے کھانے کے لئے ایک "ایوننگ سوٹ" بھی چاہئے مئی و جون کی گرمی میں اگر کوئی ڈنر رچایا جائے تو اس کا پہننا بھی ضروری ہے جب انگریزوں نے نرم کالر اور ریشمی سوٹ پہننے شروع کئے۔ تب ہندوستانیوں کے لئے بھی یہ باتیں جائز ہو گئیں۔ مگر اس سے پہلے نہ تھیں۔ بہت مدت تک ہندوستانیوں کو یہ خیال رہا کہ دھوتی پہننا یا ٹانگوں اور پیروں کا کوئی حصہ ننگا رکھنا اصول (Decency) کے خلاف ہے۔ لیکن جب انگریزوں نے دو جانگیے پہننے شروع کئے۔ تو ہندوستانیوں نے بھی اپنے اصولہائے (Decency) کو تبدیل کر لیا۔ غرض کہاں تک بتاؤں۔ اِس قومی غلامی نے ہمیں انگریزوں کی پوشاک اور اُن کے فیشن کا غلام بنا دیا۔ اور یہ لازمی تھا۔

مَیں تبدیلی کے برخلاف نہیں۔ لیکن تبدیلی کسی اصول پر اور کسی فائدے کو

مدِ نظر رکھ کر ہونی چاہئے۔ جو تبدیلی محض غلامی کے اثر سے ہوتی ہے۔ وہ مضر ہوتی ہے۔ اور ایسے انسان کے ضمیر میں غلامی کی عادتیں بڑھ جاتی ہیں۔ ہماری تعلیم یافتہ جماعت نے اِسی غلامی کی تاثیر میں اپنی عورتوں کی پوشاک میں کثیر تبدیلیاں کر لی ہیں۔ انگریز دُنیا میں جہاں جاتے ہیں۔ اپنی پوشاک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایشیائی بادشاہوں کے دربار میں جانے کے لئے بھی اُنہوں نے اپنی پوشاک کو تبدیل نہیں کیا۔ مگر ہندوستانی نہ صرف یورپ میں جاکر یوروپین پوشاک پہنتے ہیں۔ بلکہ اپنے ملک میں بھی اُس پوشاک کا پہننا اپنی سیلف رسپکٹ کے لئے ضروری جانتے ہیں۔ ہندوستانی تعلیم یافتہ عورتوں نے اپنے لئے انگریزی لیڈیوں کی نقل میں فراک۔ بلوس پیٹی کوٹ اور لہنگے وغیرہ سب انگریزی بنا لئے ہیں۔ حالانکہ اُن کی اپنی پوشاک دُنیا بھر کی پوشاکوں میں نہایت خوبصورت۔ نہایت موزوں اور نہایت آرام دہ ہے۔ ہمارا موزونیت کا سٹینڈرڈ بھی دِن بدن تبدیل ہو رہا ہے۔ ہندوستانی عورتیں ایسی پوشاک کی شوقین ہوتی جاتی ہیں۔ جو ہندوستانی سٹینڈرڈ سے نہایت بیحیائی و بےشرمی کی پوشاک ہے۔ انگریزی سٹینڈرڈ کے لحاظ سے پیر کا ننگا رکھنا بیتمیزی ہے۔ ہندوستانی سٹینڈرڈ سے چھاتی کا ننگا کرنا پرلے درجے کی بیحیائی ہے۔ مگر ہندوستانی تعلیم یافتہ صاحبوں کو انگریزی سٹینڈرڈ پسند ہے اور اُسی کے عاشق ہیں۔

اس کے یہ معنے نہیں کہ مَیں بھدی۔ نازیبا پوشاک کے حق میں ہوں۔ میں پوشاک میں خوبصورتی چاہتا ہوں۔ پوشاک کی دو اغراض ہو سکتی ہیں۔ اوّل آرام۔ دوئم خوبصورتی۔ پوشاک وہ ہونی چاہئے۔ جس میں یہ دونوں مطلب حاصل ہوں۔ لیکن فی الحال جب تک ہم قومی حیثیت میں غریب مفلس اور کنگال ہیں۔ ہم خوبصورتی کو قربان کر سکتے ہیں۔ اور محض ضروری آرام کی

پوشاک پر گذارہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر خوبصورتی بھی درکار ہو۔ تو ہندوستانی پوشاک سے یہ غرض کافی طور پر حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمیں اپنی پوشاک کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بجائے اسکے کہ غلامانہ طور پر دوسروں کی نقل کرنے لگیں۔ یہ باتیں ظاہرا بہت خفیف معلوم ہوتی ہیں مگر انسان کے دل و دماغ پر ان کا بہت اثر پڑتا ہے۔ انسان نامعلوم طور پر ان لوگوں کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے۔ جن کی وہ نقل کرتا ہے۔ اور ان لوگوں سے کنارہ کشی کرتا ہے۔ جن کی زبان۔ جن کا لباس و جن کی عادات اس کو غیر مہذب و ناشائستہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس وقت تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں اور اس ملک کے عوام الناس میں جو فاصلہ ہے۔ وہ انہیں باتوں سے بڑھتا جاتا ہے۔ اور ملک و قوم کا بہترین مفاد یہ چاہتا ہے۔ کہ اسکو کم کیا جائے۔

ہمارے کھیل تماشے

میں ہندوستانی تعلیم یافتہ جماعت کی تمام زندگی پر جب دھیان دیتا ہوں تو مجھے اس زندگی کا بہت حصہ انگریزی عادات کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے اس میں قومیت کا نشان صرف اُن کا رنگ اور اُن کی پولیٹکل بیچارگی ہے قومیت کے نشانات میں قومی کھیل ہیں۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے اس ملک میں لوگ دیسی کھیل کھیلتے تھے۔ مگر اب تعلیم یافتہ جماعت نے دیسی کھیل بالکل چھوڑ دیئے ہیں۔ اور جگہ جگہ ہم کو انگریزی کھیلوں کا رواج دکھائی دیتا ہے۔ کرکٹ۔ فٹ بال۔ ٹینس۔ بلیرڈ وغیرہ سب انگریزی کھیل ہیں۔ ان کھیلوں کے لئے خاص پوشاک اور خاص اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے جن پر کافی خرچ آتا ہے۔ جس خرچ کا ایک معقول حصہ ملک سے باہر جاتا ہے۔ جو لوگ یہ خرچ برداشت نہیں کر سکتے وہ عموماً کچھ ورزش نہیں کرتے۔ دیسی کھیلوں کا رواج ملک میں سے برباد ہو گیا۔ تعلیمیافتہ جماعت ان کھیلوں کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ جس کا اثر غیر تعلیمیافتہ جماعت پر بھی ہوتا ہے۔ گتکا۔ پٹہ۔ لاٹھی۔ گھنڈی۔ چوسی بلی۔ گلی ڈنڈا یہ سب کھیل پیچھے پڑ گئے۔ دیہات میں بھی جہاں زندگی کی کشمکش نہایت سخت ہو گئی ہے۔ ان کھیلوں کا رواج نہیں رہا۔ جن کے پاس فرصت و روپیہ ہے

وہ انگریزی کھیل کھیلتے ہیں۔ جن کو غربت و عدم فرصتی نے گھیر رکھا ہے۔ وہ کھیل ہی نہیں کھیل سکتے۔ اِس سے قومیت کی صحت کو بہت دھکا پہنچ رہا ہے اور قومیت کی ایک زبردست علامت گم ہو جاتی ہے۔ اگر مہاراج رامچندر یا مہاراج کرشن آج کسی معجزہ سے گول باغ میں سے یا ہمارے کالجوں کے میدانوں سے گذریں تو اُن کو بہت دیر تک یہ سوچنا پڑے گا۔ کہ آیا ان کالجوں کے لڑکے اور ان کھیلوں کے کھیلنے والے اُسی نسل سے ہیں۔ جن میں سے ہونے کا فخر ان کو حاصل تھا۔ اُنکے وقت میں گھوڑے کی سواری۔ پتھر اندازی۔ نشانہ بازی شرفا کے کھیلوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مگر اب شریفوں نے ان کو بھی چھوڑ دیا ہے +

مَیں چھ ماہ تک جاپان میں رہا۔ میں نے ان کے کالج۔ مدرسے اور یونیورسٹیاں دیکھیں۔ جاپانی ورزش پر خاص توجّہ دیتے ہیں۔ اِن کے جسم نہایت سڈول ہوتے ہیں۔ ان کے مذہبی کالجوں میں بھی ورزش پر خاص توجہ دیجاتی ہے۔ انہوں نے ایک امریکن کھیل کو جس کا نام "بیس بال" ہے۔ اختیار کر لیا ہے۔ وہ اپنی کلبّوں میں ٹینس و بیڈمنٹن بھی کھیلتے ہیں۔ لیکن ان کے کالجوں و سکولوں میں عموماً اُنکے قومی کھیل سکھائے جاتے ہیں۔ اِن قومی کھیلوں میں گھوڑے کی سواری نشانہ بازی۔ تیر اندازی۔ جیوجِتسو چلانا۔ جیوجِتسو وغیرہ بہت توجّہ دیجاتی ہے۔ جاپانی قوم ایک بحری قوم ہے۔ اِس لئے وہ اپنے ہر ایک نوجوان کو تیرنا و کشتی چلانا سکھاتے ہیں۔ کشتی چلانے کی مشق وہ پانی سے باہر سکول و کالج کے احاطہ میں بھی کراتے ہیں۔ لکڑی کا ایک اوزار انہوں نے ایسا بنایا ہے۔ جس سے چپّو چلانا آجاتا ہے۔ مَیں نے جہازوں پر بھی یہ اوزار دیکھا ہے +

امریکہ میں امریکن لوگوں نے اپنا ایک قومی کھیل ایجاد کیا ہے۔ جس کا نام "بیس بال" ہے۔ یہ اہل امریکہ کا قومی کھیل ہے۔ اِس وقت یورپین تہذیب کا

دور دورہ ہے۔ یوروپ دُنیا پر پولیٹکل حکومت کرتا ہے۔ اِس واسطے یہ امر لازمی ہے۔ کہ یوروپین طریقے کسی حد تک دُنیا میں پھیلیں۔ جو قومیں آزاد ہیں۔ وُہ یوروپین طریقوں کو صرف اس حد تک اختیار کرتے ہیں۔ جس حد تک انکے اختیار کرنے سے ان کی قومیت قومی شخصیت میں فرق نہ آئے۔ مثلاً اہلِ جاپان نے یوروپین لوگوں کے بعض طریقے اختیار کئے ہیں۔ مگر اپنی قومی شخصیت میں ایسے فرق نہیں آنے دیا۔ جاپانی زبان ایک زندہ زبان ہے وہ اپنے مدرسوں کالجوں میں یوروپ کی سب زبانیں سکھاتے ہیں۔ اور اپنے کمرشیل سکول میں ہندوستانی بھی پڑھاتے ہیں۔ مگر ان کے کلچر کی زبان ان کے کاروبار کی زبان۔ انکے اخبارات کی زبان۔ ان کی خط وکتابت کی زبان جاپانی ہے۔ جاپان میں جو انگریزی اخبار چھپتے ہیں ان کی اشاعت نہایت محدُود ہے۔ شاید ہی کوئی اخبار ہوگا جس کی اشاعت سینکڑوں سے بہت زیادہ ہو۔ حالانکہ جاپانی اخباروں کی اشاعت لاکھوں تک ہے۔ جاپانی کالجوں و یونیورسٹیوں میں تمام تعلیم جاپانی زبان میں ہوتی ہے۔ وہ یوروپین پروفیسر واستاد نوکر رکھتے ہیں۔ مگر ان کو ہمیشہ ماتحتی میں رکھتے ہیں۔ کبھی ان کو کسی محکمہ کا افسر اعلےٰ یا ڈائرکٹر یا پرنسپل یا گورنر یا منیجر نہیں بناتے۔ اسی طرح جاپانیوں نے یوروپین اقوام کے بعض کھیل اختیار کر لئے ہیں مگر ان کا رواج نہایت محدُود ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی کوئی جاپانی تعلیمیافتہ ایسا نہیں جو اپنے قومی کھیلوں سے واقف نہ ہو۔ ان کے سکولوں کالجوں یونیورسٹیوں میں جاپانی کھیلوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

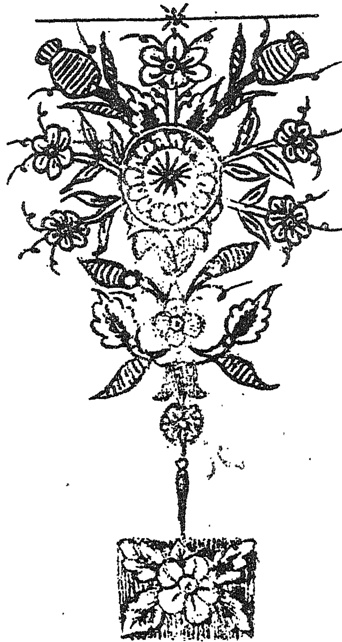
ہندوستان میں ٹھیک اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ہمارے "قومی" مدارس و کالجوں میں بھی قومی کھیلوں پر کافی توجہ نہیں دیجاتی۔ لڑکے ان قومی کھیلوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور نہ اس کے لئے چندہ دیتے ہیں۔ ایک عمدہ بیٹ کے لئے

لئے بیس یا تیس روپے خرچ کر دے گا۔ مگر ایک اچھے گتکے کے لئے اس کو شاید پانچ روپے بھی بہت معلوم ہوتے ہیں۔ جب تک انگریزوں نے پوری پتلون کو چھوڑ کر جانگیوں کا استعمال شروع نہیں کر دیا ہندوستانی طالبعلموں نے جانگیوں کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اب بھی ہندوستانی طالبعلم گھٹنوں تک کی جرابوں کے بغیر جانگئے پہننا پسند نہیں کرتے یہ سب علامتیں غلامی کی ہیں۔ یہ ذکر تو میں نے مردانہ و گھر سے باہر کی کھیلوں کا کیا۔ ہماری عورتوں کو بھی سوائے ٹینس و بیڈ منٹن کے اور کوئی کھیل پسند نہیں آتا؛

اب گھر کے اندر کے کھیلوں کو دیکھئے۔ تاش غالباً ہمارا پرانا کھیل ہے شطرنج بھی ہمارا اپنا کھیل ہے۔ چوسر بھی ہمارا کھیل ہے۔ لیکن برج ہمارا کھیل نہیں ہے۔ اور تاش سے جوا کھیلنا یہ غالباً بالکل یوروپین انسٹی ٹیوشن ہے انگریزوں نے قمار بازی کو اس ملک میں جرم ٹھیرا رکھا ہے۔ جوئے خانہ میں جوا کھیلنا جرم ہے۔ مگر انگریزی و ہندوستانی کلبوں میں ہر روز جوا کھیلا جاتا ہے۔ وہ کسی طرح سے بھی اخلاق کا مخرب شمار نہیں کیا جاتا۔ میں پچھلی دفعہ جب کلکتہ گیا۔ وہاں مجھے ایک بہاری رئیس سے ملنے کا اتفاق ہوا جو عدم تعاونی ہیں۔ کھدر پہنتے ہیں اور ہر طرح سے ریڈیکل ہیں۔ مجھے وہ اپنے گھر لے گئے۔ میں نے ان کو نہایت فخر سے اپنی انگریزی تعلیم یافتہ اہلیہ سے یہ کہتے سنا کہ ایک رات میں انہوں نے برج کھیلتے ہوئے ۱۵۰ روپیہ کمائے اور اس ڈیڑھ سو روپیہ سے وہ اپنی بیوی کے لئے تحفے تحائف لائے۔ مجھے ایک دفعہ ایک بنگالی ڈاکٹر نے اس سے پہلے بھی بتایا تھا۔ کہ کلکتہ کی ایک نہایت بڑی ہندوستانی کلب میں "تہذیب یافتہ" و "تعلیم یافتہ" ہندوستانی شریف سینکڑوں روپیہ ہار اور جیت جاتے ہیں۔ یہ دستور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں پھیلا

ہوا ہے۔ برج میں جوا کھیلنا بہت عام ہوتا جاتا ہے۔ میں اس کے اخلاقی پہلو پر بحث نہیں کرتا۔ صرف ایک امر واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ہمارے بعض نوجوان تعلیم یافتہ بھائی کئی کئی گھنٹے ہر روز برج کھیلتے ہیں۔ ان کو اخبار تک پڑھنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کھیل کود انسانی زندگی کا ایک ضروری جزو ہے۔ جس شخص نے اپنی دل لگی کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ اور جو تمام دن رات سنجیدہ کام ہی کرتا ہے کبھی ہنستا کھیلتا نہیں۔ وہ اپنی زندگی سے پورا حظ نہیں اٹھاتا اور نہ اپنی تندرستی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اس لئے میں اپنے ملک میں ہنسی خوشی کو زیادہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ نوجوان ہی نہیں۔ بلکہ عمر رسیدہ بوڑھے لوگ بھی کھیلا کودا کریں۔ لیکن میں اس امر کو پسند نہیں کرتا کہ ہم کھیل کود میں ایسے مستغرق ہو جائیں کہ باقی تمام قومی سماجک فرائض کو بھول جائیں۔ روپیہ کمانا و برج کھیلنا ہی ہماری زندگی کا مقصد نہیں ہو جانا چاہیئے کھیل کود میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے۔ اور کھیل کود میں بھی قومیت کے نشان باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مرض اتنا بڑھ گیا ہو کہ اب پیچھے قدم اٹھانا ہی ہمارے واسطے ناممکن ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے سوشل لیڈر اس بارہ میں بیٹھ کر مشورہ کریں۔ اور بڈھوں جوانوں کے لئے اسی قسم کے کھیل کود تجویز کریں جس سے "کم خرچ بالا نشینی" پوری ہو جائے اور جس سے قوم کے تمام حلقوں میں کھیل کود کی عادت جو زائل ہو گئی ہے۔ پھر رائج ہو جائے اور قومی کھیلوں پر توجہ زیادہ ہو جائے۔ میں اپنے نوجوان بھائیوں کو کھیل کود دل لگی سے ہٹانا نہیں چاہتا مگر مجھے یہ دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے۔ کہ وہ تمام قومی فرائض سے پہلو تہی کر کے صرف کھیل کود میں لگے رہیں۔ ہم اس وقت اپنی زندگی کے ایک نہایت مشکل گذار مرحلے سے گذر رہے ہیں اور ہم کو اپنی نجات کے لئے تمام طبقات اور تمام

جماعتوں کی مدد و شرکت کی ضرورت ہے۔ کوئی شخص ایسا حقیر یا نالائق نہیں ہے۔ جو اس قومی عمارت کی تعمیر میں کچھ حصہ نہ لے سکے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ مدد دے سکتا ہے۔ اور اس کو دینی چاہئے ؛



گھروں کی سجاوٹ

اور

گانا بجانا

دُنیا میں تہذیب کی علامتوں میں سے گانا بجانا ایک زبردست علامت ہے۔ ہر ایک مُلک کی شخصیت قائم کرنے میں اِس مُلک کے گانے بجانیکے طریق اُونچی جگہ پر رکھے جاتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کی شخصیت کے قائم کرنے میں مفصلہ ذیل خصوصیتیں مدد دیتی ہیں :-

(۱) ہمارا مذہب اور ہمارے مذہبی سٹینڈرڈ +

(۲) ہمارا علم طب +

(۳) ہمارا علمِ موسیقی +

(۴) ہمارا سوشیل قانون اور اِس میں عورتوں کا درجہ +

یہ فہرست ختم نہیں ہے +

ہندوؤں کا علمِ موسیقی نہایت قدیم ہے۔ اور سائنٹفک ہے۔ اسکے اصول یُوروپین موسیقی سے مختلف ہیں۔ ہندوؤں نے گانے بجانے میں

اِس وقت کمال پیدا کیا تھا۔ جبکہ یُوروپ کی قومیں ابھی اپنی حالتِ طفلی سے نہیں نکلی تھیں۔ چاروں ویدوں میں سے ایک وید گایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے گانے بجانے کے ساز بھی نہایت عمدہ ہیں۔ قومیت کی ایک تمیز گانا بجانا ہے۔ زمانہ حال کے ہندوؤں نے اس کو بھی ترک کر دیا ہے۔ مجھے اِس ہُنر میں بالکل دخل نہیں۔ مگر مَیں نے اکثر اُستادوں سے سُنا ہے۔ (جنمیں ہندوستانی اور انگریز دونوں شامل ہیں) کہ ہارمونیم نہایت ہی بیہُودہ ساز ہے۔ جو در غلا ہونے کی وجہ سے آسانی سے سیکھا جاتا ہے۔ مگر جو حقیقت میں فن موسیقی کا خون کرتا ہے۔ ڈاکٹر آنند کمار سوامی تو ہندوستانیوں سے بڑے ناراض رہتے ہیں۔ کہ اُنہوں نے ستار۔ سارنگی۔ طنبورہ۔ بین وغیرہ خوبصورت سازوں کو چھوڑ کر ہارمونیم کو رواج دیدیا ہے۔ وہ ہارمونیم کا نام سُنتے ہی آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ انگریز و دیگر مغربی اُستاد بھی ہارمونیم کی نسبت حقیر رائے رکھتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے اپنے ساز چھوڑ کر ہارمونیم کو مقبولیت کی جگہ بخشی ہے۔ اور اکثر ہندوستانیوں نے اپنی راگ و راگنیوں کو چھوڑ کر یوروپ کے نہایت ہی بازاری راگ و راگنیوں کو اختیار کر لیا ہے۔ تعلیم یافتہ گھرانوں میں اب "پیانو" کا رواج ہوتا جاتا ہے۔ پیانو۔ گٹار۔ رابونن اور دیگر یورپین ساز بیشک سائینٹفک ہیں۔ اور ان میں کمال پانا ایک لیاقت کا کام ہے مگر ہندوستانیوں کے لئے یہ ساز اس قدر قیمتی ہیں اور ان کو سیکھنے کیلئے اِس قدر خرچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اِس کے سکھانے والے ایسی مشکل سے اور کم ملتے ہیں۔ کہ بہُت کم ہندوستانی مرد و عورت ایسے ہیں جو ان کو اچھی طرح سے بجا سکتے ہیں۔ برعکس اس کے ہندوستانی ساز کے سکھانے والے اور ہندوستانی گانا سِکھانے والے اُستاد ہر جگہ مِل جاتے ہیں زندگی

کے اِس پہلو میں بھی ضرورت نہیں ہے۔ کہ ہم اپنا گانا بجانا چھوڑ دیں اور اپنے سازوں کو ردّی میں ڈال دیں۔ بلکہ ضرورت یہ ہے۔ کہ اپنے علمِ موسیقی کو فروغ دے کر اسی کو ترقی دیں۔ اور اس کو زمانہ کی ضروریات کے مطابق بنالیں +

مجھے اکثر ہندو مندروں میں و ہندو محفلوں میں محض ہارمونیم دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور خیال گذرتا ہے۔ کہ علم و ہنر کی جن شاخوں میں ہمارے پاس کافی سرمایہ تھا۔ اس کو بھی ہم نے بکھیر دیا۔ جو ہندوستانی ممالکِ غیر میں جاتے ہیں۔ اِن سے ممالک غیر کے باشندے درخواست کرتے ہیں کہ وُہ انکو اپنا گانا سکھائیں اور اپنے ساز بجاکر دکھائیں۔ مگر ان میں سے اکثر اس فن سے نابلد ہوتے ہیں۔ وُہ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ کہ کس طرح کوئی مرد و عورت بھی گانے سے ناواقف ہوسکتا ہے۔ مگر ان کو ہماری طبیعت کی کیا خبر۔ جو ہندوستانی اپنے قدیم طریق کا گانا گاتا ہے۔ اور اپنے ساز بجاتا ہے۔ اِس کی وُہ بڑی قدر کرتے ہیں اور اِس کا گانا سُننے کے لئے اچھّی قیمت پر ٹکٹ خریدتے ہیں +

جاپانیوں و چینیوں نے اپنا گانا بجانا تبدیل نہیں کیا۔ اور اِن کے تماشا گاہوں میں ان کا قدیم گانا بجانا بدستور جاری ہے۔ ہمارے بنگالی و مرہٹہ بھائیوں نے بھی قدیم ہندوستانی گانے بجانے کو فروغ دیا ہے۔ مگر پنجاب اِس مد میں بھی دُوسرے صوبوں سے بہت پیچھے ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی ہندوستانی گویّوں قدر نہیں کرتے۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ گانا بجانا اُن کی تعلیم کا کوئی جزو نہیں۔ پنجابی لڑکے و لڑکیاں ایک بے ترتیب درخت کی طرح نشوونما پاتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کا صرف ایک ہی اصُول ہے وُہ یہ ہے کہ اِن سے یونیورسٹی کے امتحانات پاس کرائے جائیں۔ اب لڑکیوں کی تعلیم

میں بھی یہی مقصد کام کرتا ہے۔ جیسے انگریزی لباس پہن کر اچھا ٹینس کھیلنا یا برج کھیلنا ایک مکمل پنجابی تعلیم یافتہ نوجوان کی شان کی چیز بن گیا ہے۔ ویسے ہی بے سُر کا گانا بے سُر کا بجانا اور مجلسوں میں گانے کے نام سے محض بے سُری آوازوں کا نکالنا یہ بھی انہیں کی خصوصیت ہے۔ یُوں تو گانا اور رونا سب کو آتا ہے۔ لیکن بے سُرا گانے سے لوگوں کے کانوں کو اور اُن کے احساس کو جو تکلیف ہوتی ہے۔ اُس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

مکانات کی سجاوٹ

مکانات کی سجاوٹ میں ہمارا مذاق نہایت ہی گرا ہوا ہے۔ یوروپ کی نہایت ہی بد نما تصویریں ابھی تک ہمارے کمروں کو زیبائش دیتی دیتی ہیں۔ نہ تصویروں کی خوبی میں اور نہ تصویروں کے انتخاب میں ہم کسی قسم کا مذاق ظاہر کرتے ہیں۔ بڑے بڑے یوروپین بادشاہوں یا انگریزوں کی تصویروں کو اچھی قیمت پر خرید کر ہم اپنی دیواروں کو ڈھک دیتے ہیں۔ تصویر رکھنے سے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ یا تو تصویر کا ہنر اچھا ہو اور اُس سے آنکھوں و رُوح کو فرحت ہوتی ہو۔ یہ پہچان صرف ایک لاکھ ہندوستانیوں میں سے ایک کو بھی نہیں۔ یا تصویر کا دُوسرا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ تصویر کسی پیارے دوست یا آشنا یا حبیب کی ہو۔ جس کے دیکھنے سے اس کی یاد تر و تازہ ہوتی ہو۔ مگر اکثر ہندوستانی تعلیم یافتہ گھروں میں محض بے معنی تصویریں لٹکی ہوئی ہیں۔ محض اِس واسطے کہ ان سے سجاوٹ ہو۔

کچھ عرصہ سے اِس رواج میں کسی قدر تبدیلی ہو رہی ہے۔ مگر ابھی تک پُوری نہیں ہوئی۔ اب بھی بَیں اکثر گھروں میں ایسی تصویریں دیکھتا ہوں

جن کو دیکھ کر میرے دل میں کراہیت پیدا ہوتی ہے۔ انگریز حاکموں کی تصویریں بھی ہندوستانی گھروں میں اکثر پائی جاتی ہیں۔ جو ان کی غلامی کی زندہ شہادت ہیں۔ ایک وقت تھا کہ کسی انگریز کے ساتھ بیٹھ کر تصویر کھنچوانا بڑی عزّت و فخر کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ اب اِس میلان میں کسی قدر تبدیلی تو ہوئی ہے۔ مگر تاہم ابھی تک یہ رواج جاری ہے ❊





انگریزوں کے بُت و میموریل

غلامی کی علامتوں میں سے سب سے مکروہ علامت وہ ہے۔ جو سڑکوں مکانوں اور کارخانوں کو انگریزوں کے نام سے نامزد کرنے میں پائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں کسی طرف نکل جاؤ۔ اکثر سڑکیں انگریزوں کے نام سے مشہور ہیں اور اکثر دوکانیں۔ کارخانے اور چھاپہ خانے و مکانات انگریزوں کے نام سے موسوم ہیں۔ بعض کلبیں بھی انگریزوں کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ بعض دروازوں پر بھی انگریزوں کا نام ہے۔ یہ سب سے زبردست شہادت اس غلامی کے بھاو کی ہے۔ جو ہندوستان میں عام طور پر پھیلا ہوا ہے۔ اور جس سے ہمارے بہترین تعلیم یافتہ ابھی تک آزاد نہیں ہوئے۔ یہی بھاو ہے جس سے متاثر ہو کر اکثر ہندوستانی انگریزوں کو پارٹیاں دیتے ہیں کھانا کھلاتے ہیں۔ ایڈریس دیتے ہیں۔ ڈالیاں دیتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ *

اگر کسی ہندوستانی و انگریز میں دوستی ہو اور ایسی دوستی کا ہونا ناممکنات سے نہیں ہے۔ تو دوستی کے بھاو سے کسی ہندوستانی کا ایسا کرنا کسی قدر جائز ہے۔ مگر عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ جہاں ہندوستانی بیش قیمت تحفے تحائف و ڈالیاں اپنے انگریز دوستوں کو دیتے ہیں۔ انگریز اس کے جواب

میں ایک پیالہ چاء کا دیتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ اپنا فوٹو گراف دے چھوڑتے ہیں۔ جہاں رشتہ حاکم و محکوم کا ہو۔ وہاں محبت طرفین سے نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں اِن باتوں کی تہ میں فائدہ اُٹھانے کی غرض ہو۔ وہاں یہ فعل محض غلامی کا فعل ہے۔ جو اِنسانوں کی نیچر اور ان کے بھاؤ کو ذلت کے تحت الثریٰ تک پُہنچا دیتا ہے۔ محبت و دوستی مساوی درجہ کے آدمیوں میں ہؤا کرتی ہے +

غلامی کی یہ علامتیں ہندوستانیوں کے ہر ایک طبقہ میں پائی جاتی ہیں۔ اور اِس کی شہادتیں پونا کا فرگسن کالج۔ کلکتہ کا رپن کالج اور لاہور کا بریڈلا ہال ہیں۔ مسٹر چارلس بریڈلا نے بلا شُبہ ہندوستانیوں کی خیر خواہی میں چند تقاریر پارلیمنٹ میں کیں۔ لیکن وہ خدمت اِس درجہ کی نہ تھی۔ کہ ہم ہمیشہ کے لئے اپنی ایک عمارت کو ان کے نام نامی پر موسوم کرتے مجھے یاد ہے کہ جب لاہور میں بریڈلا ہال کا پتھر رکھا گیا تو کانگرس کے کارکنان کے درمیان اِس امر پر بڑا اختلاف رائے تھا۔ مرحوم لالہ لاجپت رائے نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ کہ اِس ہال کا نام دادا بھائی نوروجی ہال رکھا جائے۔ مگر اِس وقت کی کلچر نے کثرت رائے سے ہال کو بریڈلا ہال کے نام سے نامزد کر دیا۔ ہندوستان کی گذشتہ تاریخ میں سینکڑوں نام ایسے ہیں جن کی یاد سے ہمیں خوشی و راحت ہوتی ہے۔ اور ہماری ہمتوں و حوصلوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر ہم نے اِن سب کو بھلا دیا +

انیسویں صدی میں بھی بہت سے ایسے ہندوستانی ہو چکے ہیں جنہوں نے نہایت بیش بہا خدمات اپنی قوم کی کیں۔ مگر ہم نے ان کے میموریل نہیں بنائے کلکتہ بمبئی اور مدراس میں ایک بڑی تعداد انگریزوں کے بُتوں کی ہے۔ جن پر ہندوستانیوں کے لاکھوں روپیہ خرچ ہو چکے ہیں۔ اِن کے مُقابلہ میں ہندوستانیوں کے بُت بہت ہی تھوڑے ہیں۔ جس کے معنے یہ ہوتے ہیں۔ کہ

انگریزوں نے ہندوستانیوں کے مقابلہ میں زیادہ بیش بہا خدمات ہندوستان کی کی ہیں۔ ان میں سے اکثر خدمات تو ایسی ہیں۔ جن کو یاد کرکے ہر ایک ہندوستانی کو شرم سے پسینہ پسینہ ہو جانا چاہئے۔ لاہور کی میونسپل کمیٹی کے عین وفادار ممبر لارڈ لارنس کے بُت کو اپرمال سے علیحدہ کرنے کے برخلاف ہیں۔ جب بھی کوئی گورنر جنرل۔ گورنر یا لفٹنٹ گورنر جاتا ہے تو خوشامدی ہندوستانی اس کے میموریل کا سوال پیش کردیتے ہیں اور اچھے اچھے تعلیم یافتہ و مہذّب ہندوستانی ان میموریلوں کے لئے چندہ دیتے ہیں۔ اور اپنا نام فہرست چندہ دہندگان میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

غلامی سے کمینہ پن کی عادات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ کمینہ پن اشخاص واحد سے عبور کرکے قوموں و جماعتوں کو ڈھک لیتا ہے۔ اور اگر غلامی دیر تک رہے تو یہ کمینہ پن بھی غلاموں اور غلام قوم کے ممبروں کے سبھاؤ کا جزو ہو جاتا ہے انگریزوں کی خوشامد کرنا۔ ان کے میموریل بنانا۔ ان کے نام پر سڑکوں عمارتوں کارخانوں اور گلیوں کو موسوم کرنا بھی اسی کمینہ پن کی علامتیں ہیں۔ جو ہندوستانیوں نے اپنی غلامی سے سیکھی ہیں۔ بعض انگریزوں کو اور خصوصاً پادریوں کو یہ عادت ہو گئی ہے کہ وُہ اپنے آپ کو ہندوستانیوں کے مقابلہ میں ہندوستان کا بہترین خیرخواہ سمجھتے اور کہتے ہیں۔ مَیں جب کبھی کسی انگریز سے یہ بات سُنتا ہوں تو مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔ اور مَیں فوراً یہ جواب دیتا ہوں۔ کہ اگر اسکا بیان حقیقت میں سچّا ہو تو میرے لئے سوائے خودکشی کے اور کوئی ترکیب مُنہ چھپانے کی نہ رہے۔ مگر بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانی ہیں۔ جن کے دِل میں یہ فقرہ سُن کر کبھی کسی قسم کی ہل چل پیدا نہیں ہوتی۔ جب کوئی انگریز میٹھی باتیں کرتا ہے۔ اور چند امُور میں ذرا زیادہ منصف مزاجی دکھاتا ہے۔ تو ہندوستانی اُسکی تعریف

میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ بہت سے گورنر و لفٹننٹ گورنر اوّل اوّل چند نرم باتیں کر کے ہندوستانیوں کو گرویدہ کر لیتے ہیں لیکن جب کبھی کوئی خیال ایسا پیدا ہوتا ہے جس میں ہندوستان و انگلستان کے نفع کا مقابلہ ہو تو وہ فوراً اپنی اصلیت میں ظاہر ہو جاتے ہیں +

ہندوستانی یہ نہیں سمجھتے کہ کسی انگریز کے لئے ایسی دوستی کرنا ناممکن ہے جس سے اس کے ملک و قوم کو نقصان پہنچتا ہو۔ انگریزوں کے دل میں سب سے اوّل جگہ ان کی قوم و ان کے ملک کو ہے۔ وہ اُس وقت تک مروّت و محبّت کر سکتے ہیں۔ جس وقت تک تم اُن کی قوم اور ان کے ملک کے برخلاف کچھ نہیں کہتے۔ وہ اس حد تک تمہارے ساتھ ہمدردی بھی کر سکتے ہیں۔ جس حد تک تم انگریزی قوم کی فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے انگریزی حکومت سے آزاد ہونے کی خواہش ظاہر نہیں کرتے۔ لیکن جہاں تم اس حد سے بڑھے وہاں اُنہوں نے اپنے اصلی دانت دکھائے +

جب لارڈ سڈنہم ہندوستان میں آئے اُن کا نام سر جارج کلارک تھا ہمارے ماڈریٹ بھائی ان کی تعریف میں کالم کے کالم سیاہ کر دیتے تھے اسی طرح سے مَیں نے بڑے سے بڑے ہندوستانیوں کو سر ہارکورٹ بٹلر و سر جارج لائیڈ کی تعریفیں کرتے سُنا ہے۔ ہمارے پوجنیہ بزرگ پنڈت مدن موہن مالوی جی تو لارڈ ریڈنگ پر عاشق ہو گئے ہیں۔ اسی طرح سے اور بھی ہندوستانیوں کا حال ہے اور اسی واسطے میرا یہ خیال ہے کہ انگریزی پالیٹیشن و مدبّر ہندوستانیوں کو پالیٹکس کے میدان میں محض بچّہ سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ بچّوں کی طرح تھوڑی سی مٹھائی سے خوش ہو جاتے ہیں۔ اور خوش ہو کر اپنے مربّی کے راگ گانے لگتے ہیں +

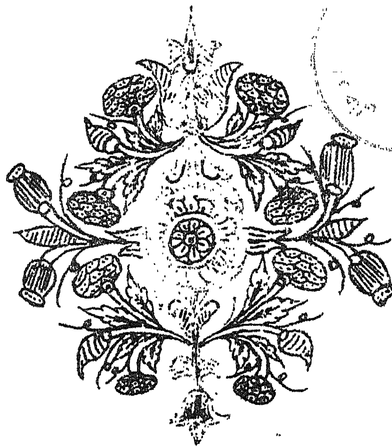
مالوی جی نے لارڈ منٹو کی یادگار میں الہ آباد میں گنگا کے کنارے ایک بڑا استمبھ (ستون) کھڑا کر دیا تھا۔ اب وہ ہزاروں روپے شہزادہ ویلز کی آمد پر خرچ کرنے والے ہیں۔ ملک میں لاکھوں آدمی اناج کے نہ ملنے سے ہاہاکار مچا رہے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں بچے یتیم ہیں اور اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ہزاروں بچے ہر ایک شہر میں مارے مارے پھرتے ہیں اور اُن کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ جاڑے کے دِنوں میں خاندان کے خاندان ٹھٹھر کر مر جاتے ہیں۔ اُن کو کپڑا بستر نہیں آتا۔ مگر ہمارے دیش کے اوچ پدوی والے دیش بھگت شاہزادہ ویلز کے استقبال میں ہزاروں روپیہ ہندو یونیورسٹی کے خرچ کرنے والے ہیں۔ وہ اسی کو دیش بھگتی سمجھتے ہیں۔ اور یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ انگریزی قوم ان کی اس حرکت سے خوش ہو کر اُن کو سوراجیہ دیدے گی؟

میں کئی دفعہ یہ لکھ چکا ہوں۔ کہ میرے دِل میں انگریزی قوم کے لئے بڑا ادب ہے۔ اور ولایت کے انگریزوں میں کئی اصحاب ایسے ہیں جنکو میں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ اور جو میرے ساتھ مساوات کا سلوک کرتے ہیں۔ انگریزوں میں ایسے وجود بھی ناپید نہیں ہیں۔ جو ہندوستان کے لئے مکمّل آزادی کے وکیل ہیں۔ لیکن یہ موجودہ سرکاری حلقوں سے باہر ہیں۔ سرکاری حلقوں میں مجھے کوئی انگریز دکھائی نہیں دیتا جس پر میں ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں پورا بھروسہ و وشواس کر سکوں۔

بہرحال شاید وقت آ گیا ہے۔ کہ ہندوستانی غلامی کی ان عادات سے جن کا ذکر میں نے اِس آرٹیکل میں کیا ہے۔ سبکدوش ہوں آئندہ

نسلوں کے ساتھ یہ بڑا ظلم ہے۔ کہ ہم ان کے وطن میں غلامی کی، ان شہادتوں کو دن بدن ایزاد کرتے جائیں۔ اور ملک کا ہر ایک کونہ و گوشہ ہماری غلامی پر پھٹکار کرتا ہوا ہمارے کمینہ پن کا شاہد ہو ٭

تمت بالخیر



نوٹ:- مندرجہ ذیل کتب کے علاوہ ہر قسم کی پولٹیکل و انگریزی کتب ہمارے ہاں سے مل سکتی ہیں۔ منیجر بک ڈپو پھاٹک حبش خان

قابل مطالعہ پولٹیکل کتابیں

گاندھی چرتر

شریمان پوجنیہ پادھماتما کرمچند موہنداس گاندھی کا مکمل و مفصل جیون چرتر معہ چند تقاریر۔ آجتک جسقدر جیون چرتر مہاتما جی کے شائع ہوئے ہیں۔ یہ کتاب سب سے زیادہ دستار پودک ہے سرورق پر مہاتما جی کا ایک خوبصورت رنگین چرتر بھی دیا گیا ہے۔ قیمت اردو ۹ر۔ ہندی ۸ر

مالوی چرتر

فخر قوم و ملک شریمان پنڈت مدن موہن مالویہ کا مفصل و مکمل جیون بمطابق معہ تقاریر و بیغرضانہ خدمات جو آپ اپنے ملک اور قوم کی سرانجام دے رہے ہیں۔ پنجاب میں ایام مارشل لا میں جو خدمات آپ نے پنجاب نواسیوں کی کی ہیں۔ اُن کا ذکر خاص طور پر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ نیز پنجاب کے بارے میں معرکتہ الآراء تقریر جو آپ نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں کی تھی۔ اس میں بجنسہ درج کردی گئی ہے۔
قیمت صرف آٹھ آنے ۸ر

تلک چرتر

محبان وطن کے سرتاج بھارت کے مایۂ ناز سورگ باشی لوکمانیہ بھگوان تلک مہاراج کا مرشیوتک کا مفصل حال قیمت اردو ۸ر ہندی ۸ر

بلبل ہند سروجنی کی مختصر سوانح عمری معہ خلاصہ تقاریر
قیمت صرف پانچ آنے ۵ر

ہندوستان ہندوستانیوں کیلئے

بنگال کے مایۂ ناز دیش بندھو بابو سی۔ آر داس کی اُن ملکی اور قومی تقاریر کا دلفریب مجموعہ جس میں آپ نے نہایت قابلیت اور بیخوفی سے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے لئے ہے۔ اس کتاب کے شروع میں سچے دیش سیوک بابو موتی لال گھوش ایڈیٹر امرت بازار پتریکا کی قلم سے نکلا ہوا نہایت زبردست دیباچہ دیا گیا ہے۔ جو کہ بذات خود ایک قابل دید چیز ہے۔ سرورق پر بابو آر۔ داس کا ہاف ٹون دیا گیا ہے
قیمت فی جلد صرف بارہ آنے ۱۲ر

ترانۂ قوم

یہ خوبصورت و مفید کتاب عین موجودہ زمانہ کے مطابق ہے۔ اس میں ملک کے بہت سے مشہور و معروف اردو شاعروں کی ولولہ انگیز اور قومی نظمیں دی گئی ہیں۔ تمام نظمیں ملک و قوم کے درد سے بھرپور ہیں یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ کہ شاعر ملکی ترقی میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرنے کی قابلیت اور طاقت رکھتے ہیں۔ یقیناً نظم نثر سے زیادہ دلوں کو اُبھارتی ہے۔ ترانۂ قوم میں درج کردہ قریب ۵۰ نظموں میں یہ خصوصیت خاص طور پر آپ پائیں گے۔ جو لوگ وطن کا درد دل میں رکھتے ہیں اُنکو ایسی کتب کا

مُطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا - کاغذ نہایت ہی اعلےٰ لکھائی چھپائی نفیس ہے قیمت ۱۲؍ +

ترانۂ وطن } یہ کتاب ترانۂ قوم کا دوسرا حصہ ہے جس کی تمام نظمیں ترانۂ قوم سے بالکل مختلف ہیں - اس میں مُلک بھر کے مشہور قومی شاعروں کی وہ زودِ اثر اور ولولہ انگیز نظمیں دی گئی ہیں جنکو عوام بہت پسند کرتے ہیں - اور جنکے پڑھنے سے حب الوطنی کا جذبہ مُردہ سے مُردہ دلوں کو بھی پیدا ہو جانا امر یقینی ہے - ایسی زبردست پولیٹیکل گیتوں کی کتاب اس سے پیشتر آپکی نظر سے نہ گذری ہوگی قیمت صرف ۸؍

ایک سال کے اندر سوراجیہ

اِس لاجواب کتاب میں مہاتما گاندھی کے اُن مضامین اور لیکچروں کا اُردو ترجمہ ہے - جو سوراجیہ کی ضرورت اور اُس کے ایک سال کے اندر اندر حاصل ہو سکنے کے وسائل پر زبردست روشنی ڈالتے ہیں - اہل ہند کے لئے یہ ایک نہایت ضروری کتاب ہے جس کا مُطالعہ ہر اُردو خواں شخص کو کرنا چاہیئے - قیمت صرف .... ۸؍

ہندوستان کے لئے سوراجیہ } یہ کتاب بھی

مہاتما گاندھی جی ہی کی تصنیف ہے ... اصل کتاب انگریزی زبان میں ہے - اُردو دان اصحاب کی خاطر با محاورہ سلیس اُردو ترجمہ کرا کر چھپوایا گیا ہے - کتاب کی ضرورت اور دلچسپی کیلئے مہاتما گاندھی جی کا مُصنّف ہونا ہی کافی ہے -

قیمت صرف چودہ آنے .... ۱۴؍

آروگیہ دگ درشن } اسکے مصنف بھی مہاتما گاندھی جی ہیں - اِس میں مفصّل طور پر اصُول تندرستی پر بحث ہے - بتایا گیا ہے کہ انسان کو اپنی تندرستی کے قائم رکھنے کے لئے کن کن اصُولوں کی پابندی کرنی چاہیئے قیمت اُردو ۳؍ ہندی ۳؍

مہاتما گاندھی کی بنسری

جس میں مہاتما جی کے عدم تعاون کی موجودہ ایجی ٹیشن اور بے چینی کے علاج نہایت زبردست تقاریر اور مضامین درج کئے گئے ہیں - نہایت قابل کتاب ہے جس کے دیکھنے سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے - یہ مہاتما جی کی زبردست تصنیف ہے - قیمت صرف ۵؍

چپلا } ایسا پُرلطف و سبق آموز ناول اِس سے پہلے آپکی نظر سے نہ گذرا ہوگا - یہ ہندی کی ایک مقبولِ عام تصنیف کا اُردو ترجمہ ہے - قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱؍۸

کتابیں ملنے کا پتہ **نرائن دت سہگل اینڈ سنز لاہور** بیرون لوہاری

یا

آریہ بک ڈپو لاہور

قیمت مع ...

ضخامت ... صفحات

دنیا کا امن

ہر ہٹلر کی زبان اور تلوار کی نوک پر

اس نے یہ طاقت کیسے حاصل کی؟

یہ راز جاننے کے لئے ہر ہٹلر کی مشہور عالم تصنیف

میری جدوجہد

مترجمہ

شری پت شانتی نارائن سابق ایڈیٹر "بندے ماترم" لاہور و "سوراجیہ" الہ آباد

جو جولائی گذشتہ تک دنیا بھر کی سب زبانوں میں ۲۶ لاکھ فروخت ہو چکی ہے

اور انگریزی میں ترجمہ ہونے پر صرف ایک ماہ میں چھ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت

ہو گئے ہیں جلد طلب فرمایئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑیگا

پبلشرز:- نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

Only Title Page Printed at The Lakshmi Art Press Lahore.